بسم اللہ الرحمن الرحیم — نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم — وعلی عبدہ المسیح الموعود

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ

ہفت روزہ بدر قادیان

ڈاکٹر عبدالسلام نمبر

جلد ۴۸

ایڈیٹر۔ منیر احمد خادم

نائبین: قریشی محمد فضل اللہ، محمد نسیم خان

شمارہ ۴۹-۵۰

شرح چندہ
سالانہ 100 روپے
بیرونی ممالک
بذریعہ ہوائی ڈاک
20 پونڈ یا 40 ڈالر امریکن
بذریعہ بحری ڈاک
10 پونڈ یا 20 ڈالر امریکن

THE WEEKLY BADR QADIAN - 143516
POSTAL REGISTRATION NO . P/GDP - 23

۲۳/۳۰ رجب ۱۴۱۷ ہجری ٭ ۵/۱۲ رفتح ۱۳۷۵ ہش ٭ ۵/۱۲ دسمبر ۱۹۹۶ عیسوی

ہفت روزہ بدر قادیان

اخبارِ احمدیہ

لنڈن ۲۹ نومبر (ایم۔ ٹی۔ اے) سیدنا حضرت امیرالمومنین خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیر و عافیت ہیں۔ حضور پُر نور ان دنوں سفر پر ہیں اور آج حضور نے سویڈن کی مسجد بیت المحمد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا جو مسلم ٹیلی ویژن احمدیہ کے ذریعہ دنیا بھر میں دکھایا گیا۔ احبابِ جماعت حضور اقدس کی صحت و سلامتی درازیٔ عمر، مقاصدِ عالیہ میں فائز المرامی کے لئے دُعائیں جاری رکھیں۔

دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے علومِ جدیدہ حاصل کرو اور بڑے جدوجہد سے حاصل کرو

میرے فرقہ کے لوگ اسقدر علم و معرفت میں کمال حاصل کریں گے

کہ

اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رُو سے سب کا منہ بند کردیں گے

کلماتِ طیّبات سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السّلام

"میری یہ باتیں اس لئے ہیں کہ تاتم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو اور اس تعلق کی وجہ سے میرے اعضاء ہو گئے ہو ان باتوں پر عمل کرو اور عقل اور کلام الٰہی سے کام لو تاکہ سچی معرفت اور یقین کی روشنی تمہارے اندر پیدا ہو اور تم دوسرے لوگوں کو ظلمت سے نور کی طرف لانے کا وسیلہ ہو اس لئے کہ آجکل اعتراضوں کی بناء طبعی اور طبابت اور ہیئت کے مسائل کی بناء پر ہے اس لئے لازم ہوا کہ ان علوم کی ماہیت اور کیفیت سے آگاہی حاصل کریں تاکہ جواب دینے سے پہلے اعتراض کی حقیقت تو ہم پر کھل جائے.....

پس ضرورت ہے کہ آجکل دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے علومِ جدیدہ حاصل کرو اور بڑے جدوجہد سے حاصل کرو۔ (ملفوظات جلد اوّل (مطبوعہ لنڈن صفحہ ۶۸)

(۲) خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا۔ (باقی صفحہ ۱۹ پر دیکھئے)

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسّلام مرحوم و مغفور (۱۹۲۶ء؛ ۱۹۹۶ء)

عقل کی روشنی کے اعتبار سے ڈاکٹر عبدالسّلام کی فضیلت ساری دنیا میں مُسلّم ہے

جس شان کے ساتھ خدائے واحد و یگانہ کے ایمان کا حق ڈاکٹر عبدالسلام نے ادا کیا ہے کوئی اور سائنسدان اس شان کا آپکو دنیا میں نہیں دکھائی دیگا

خُلاصہ خُطبہ جُمعہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ فرمودہ ۲۹ نومبر سنہ ۱۹۹۶ء

لنڈن ۔۔ (ایم۔ ٹی۔ اے) سیدنا حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مسجد فضل لنڈن میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہوئے محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم و مغفور کا نہایت ایمان افروز انداز میں ذکر فرمایا۔

حضور انور نے سورہ رحمٰن کی آیت ۲۷ تا ۳۱ کی تلاوت فرمائی اور پھر ترجمہ کرتے ہوئے فرمایا:-

جو کچھ بھی زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے اور صرف تیرے رب کی شانِ جمال و جلال ہے جو باقی رہے گی پس تم اپنے ربّ کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے اُسی سے سوال کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ ہر وقت ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے پس تم اپنے رب کی کن کن آیات کی تکذیب کرو گے۔

پھر فرمایا یہ آیات بہت ہی گہرے عارفانہ مضامین پر مشتمل ہیں جو چھوٹوں اور بڑوں جنّوں اور انسوں سب کے لئے ایک عظیم چیلنج ہیں جس میں سب کو فانی قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت میں ہر فانی انسان اپنے آپ کو لافانی سمجھ رہا ہوتا ہے سب کو مرتے دیکھتا ہے لیکن اپنی موت سے غافل رہتا ہے اور جب وہ گزرے گا تو ان لمحوں میں یہ خیال کہ وہ فانی تھا اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

حضور پُر نور نے ڈاکٹر عبدالسلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ عقل کی روشنی کے اعتبار سے ڈاکٹر عبدالسلام کی فضیلت ساری دُنیا میں مسلم ہے کوئی دُنیا کا سائنسدان نہیں ہے جو عظمت کی نگاہ سے آپ کو نہیں دیکھتا بلکہ اخلاقی قدروں اور عظمت و کردار کے لحاظ سے یہ وہ سائنسدان ہے جس کی دُنیا کے بڑے بڑے بادشاہ عزت کرتے تھے اور حقیقت میں اُن کے سامنے عظمت کے ساتھ تعظیم کرتے تھے

ڈاکٹر صاحب اپنے والد بزرگوار اور والدہ محترمہ کی دُعاؤں کا پھل تھے انہوں نے آپ کی پیدائش سے پہلے کشف میں دیکھا کہ خدا نے آپ کو بیٹا دیا ہے اور اس کا نام عبدالسلام ہے۔

حضور انور نے فرمایا کہ ساری زندگی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے اس کشف کی سچائی کو ظاہر کیا اور اس بات کا قطعی ثبوت آپ کی زندگی کے لمحہ لمحہ نے دیا جس شان کے ساتھ خدائے واحد و یگانہ کے ایمان کا حق ڈاکٹر عبدالسلام نے ادا کیا ہے اور اس جھنڈے کو بلند کیا ہے ایسا کوئی اور سائنسدان اس شان کا آپ کو دُنیا میں نہیں دکھائی دے گا۔

نظامِ جماعت کے سامنے آپ کی ہمیشہ خادمانہ حیثیت رہی خلیفۂ وقت کے ساتھ ان کی انکساری کو دیکھ کر مجھے رشک آتا تھا۔ یہی چیز آئندہ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد میں بھی عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ احمدیت کو ایسی اولادیں عطا کرے جن کی پیدائش بھی سلام ہو اور جن کی موت بھی سلام کی موت ہو آمین اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو اپنی رضا کی جنتوں کا وارث بنائے۔

منیر احمد حافظ آبادی ایم اے پرنٹر و پبلشر نے فضل عمر پرنٹنگ پریس قادیان میں چھپوا کر دفتر اخبار بدر قادیان سے شائع کیا۔ پروپرائٹر۔ نگران بورڈ بدر قادیان

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

ہفت روزہ بدر قادیان
مورخہ ۵/۱۲ فتح ۱۳۷۵ ہش

توحید و سلامتی کا سائنس دان

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام مرحوم

یہ لکھتے ہوئے ایک عجیب سی کسک اُٹھ رہی ہے کہ دُنیائے احمدیت کے سپوت، تیسری دُنیا کے سائنسدانوں کے راہنما، نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام اب ہم میں نہیں رہے۔ لیکن ان سب باتوں سے اُوپر اُٹھ کر حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی جانب سے خطبہ جمعہ ۲۲۔ نومبر میں تلاوت فرمودہ یہ آیات "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ" ہر غمزدہ کے لئے سامانِ تسلی وطمانیت ہیں۔

متحدہ پنجاب کے پسماندہ ضلع جھنگ کی ایک غریب فیملی میں آنکھیں کھولنے والے عبدالسلام کو اللہ نے ایسی عظیم صلاحیتوں سے نوازا تھا کہ بچپن سے مرتے دم تک اس نے تیز رفتاری سے ترقیات کے دُشوار گذار راستوں کو طے کیا اور کبھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام صرف ایک سائنس دان ہی نہیں بلکہ اگر ان کو تیسری دُنیا کے سائنسدانوں کا مسیحا کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کے دل ودماغ میں ہمیشہ یہ تڑپ رہی کہ کسی طرح وہ دُنیا کے ترقی پذیر ممالک بالخصوص اپنے وطن پاکستان کو خوشحال اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا کھڑا کریں۔

جب پاکستان کے اربابِ حکومت نے ان کی تجاویز کو محض احمدی ہونے کی وجہ سے ٹھکرا دیا تو انہوں نے پاکستان سے باہر رہ کر اپنے عظیم بین الاقوامی سنٹر انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے ذریعہ دُنیا کے تمام پسماندہ ممالک کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ وہ جدید تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ اپنے بین الاقوامی سنٹر کو چلانے کے انتظامی اُمور کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ اور اِس طرح اس سنٹر کے ذریعہ گذشتہ تیس سالوں میں آپ نے ترقی پذیر ممالک کے سینکڑوں سائنسدانوں کو تربیت دی۔ ساتھ ہی انہوں نے تیسری دُنیا کے ممالک کے لئے خاص طور پر اقوامِ متحدہ اور اس سے ملحق اداروں کے بند دروازوں کو کھٹکھٹایا اور تنبیہہ کی کہ یورپ کی خوشی تیسری دُنیا کے ممالک کی ترقی کے بغیر ہرگز پائیدار نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے آپ نے اقوامِ متحدہ کے ادارہ "یونیسکو" میں اور نوبل انعام حاصل کرتے وقت جو تاریخی لیکچر دیا۔ اس سے ہمیشہ کے لئے غریب ممالک اور ان کے سائنسدان تا قیامت ڈاکٹر عبدالسلام کے ممنونِ احسان رہیں گے۔

مرحوم عبدالسلام صرف ایک سائنسدان ہی نہیں بلکہ وہ دل ودماغ عقل وجذبہ کا ایک حسین سنگم تھے۔ وہ جب تیسری دُنیا کے غریب ملکوں کے لئے لکھتے اور بولتے تھے تو حقیقت افروز گوشواروں اور علمی حقائق کے ساتھ ساتھ خُون کے آنسو روتے بھی تھے رُلاتے بھی تھے۔

مرحوم عبدالسلام کی زندگی کا ایک روشن پہلو یہ رہا کہ آپ نے ڈھیروں ایوارڈ و اعزاز حاصل کئے۔ دُنیا کی ہر یونیورسٹی ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کو اپنی ذات کے لئے ان ایوارڈوں سے سخت نفرت ہے۔ اُنہوں نے ان تمام ایوارڈوں کو ساتھ ہی ساتھ سائنس کی خدمت کرنے والے غریب طلباء کے لئے وقف کر دیا۔

مرحوم ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی تحقیق کا ایک خوبصورت اور روشن تر پہلو یہ ہے کہ وہ سائنس کے میدان میں تمام عُمر توحید اور دُنیا کے امن کی خاطر کام کرتے رہے۔ اُن کی تمام تر سائنسی تحقیقات کا نقطۂ مرکزی یہ تھا کہ کائنات میں کارفرما چار قوتیں دراصل ایک ہی قوت کا سرچشمہ ہیں۔ اور اس پر وہ تمام عُمر کام کرتے رہے۔ تقریباً ۱۹۶۴ء میں انہوں نے برق مقناطیسی قوت (ELECTRO MAGNATIC FORCE) اور خفیف نیوکلیائی قوت (WEAK NUCEAR FORCE) کی وحدت کا نظریہ پیش کیا۔ جس کی صداقت عملی طور پر ۱۹۷۴ء میں ظاہر ہوئی۔ اور اس پر انہیں ۱۹۷۹ء میں نوبل پرائز ملا۔ یہ نظریہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کے مختلف قوتوں کی وحدت کے وسیع تر نظریہ کی پہلی کڑی تھی۔ اس کی دُوسری کڑی برق مقناطیسی قوت، خفیف نیوکلیائی قوت اور قوی نیوکلیائی قوت کی وحدت کا نظریہ ہے۔ اور اس کے بعد چاروں قوتوں کی وحدت۔ توحید کا یہ پرستار آج ہم میں نہیں لیکن اس کا مشن آج بھی زندہ ہے۔ اور یقیناً انجام تک پہنچے گا۔

ڈاکٹر صاحب توحید کے ساتھ ساتھ تمام عُمر دنیا کے امن وسلامتی کے لئے بھی کام کرتے رہے۔ آپ ایٹم کی پُر امن طاقت اور اس کے استعمال کے حامی تھے۔ اور اس کے لئے آپ کو ۱۹۸۱ء میں "ایٹم برائے امن" کا انعام بھی مِلا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ عبدالسلام تمام عُمر توحید اور سلامتی کے علمبردار رہے۔

یہ اللہ کا فضل واحسان ہے کہ احمدیت نے دُنیا کو عظیم خدمت گاروں سے نوازا ہے۔ یعنی سیاست کے میدان میں عظیم سیاستدان چوہدری ظفر اللہ خان صاحب رضی اللہ عنہ۔ سائنس کی دُنیا میں عظیم سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم ومغفور اور اقتصادیات کی دُنیا میں عظیم ماہرِ اقتصادیات یعنی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کے پوتے حضرت ایم۔ ایم۔ احمد صاحب۔ خدا آپ کو لمبی عمر عطا کرے۔ آمین۔ لیکن عجیب بدقسمتی ہے کہ پاکستان کے اربابِ حکومت کو مُلّاؤں کے خوف وہراس کے باعث ان میں سے کوئی بھی راس نہ آیا۔ یہ بات یقینی ہے کہ پاکستان کے ان حاکموں اور مُلّاؤں کو آنے والی پاکستانی نسل کو ان عظیم خدمتگاروں کی خدمت سے محروم کر دینے کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔ اب دیکھئے کہ یہ کس قدر خوفناک بات ہے کہ کوئی قوم اپنے دین ودُنیا کے خدمتگاروں کو اپنے ملک سے دھکے دیکر نکالتی جائے۔ جب انہوں نے سیاست، سائنس اور اقتصادیات کے ساتھ ساتھ خلیفۂ برحق کو بھی اپنے ملک سے نکال دیا تو پیچھے سوائے خول کے اب باقی رہ کیا گیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ انتہا درجے کی کورپشن، بدحالی، انتہا پسندی، نفرتیں اور قتل وغارت اس ملک کی قسمت کا حصہ بن چکے ہیں۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان بزرگوں کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے نظر انداز کئے جانے میں بھی خُدا کی کوئی حکمت کارفرما ہے۔ اگر چوہدری ظفر اللہ خان صاحب صرف پاکستان میں رہتے تو آپ کی خدمات سے صرف پاکستان فیضیاب ہوتا لیکن پاکستان سے باہر رہ کر حضرت چوہدری صاحب نے نہ صرف پاکستان کی بلکہ تیسری دنیا کے کئی غریب ممالک خصوصاً عرب ممالک کی آزادی و خوشحالی کے لئے ایک عظیم کردار ادا کیا ہے۔ یہی حال پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا رہا۔ پاکستان سے باہر رہ کر آپ نے عالمگیر طور پر غریبوں اور بالخصوص مُسلمانوں کی گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ایسی خدمات جن کا پاکستان میں رہ کر انجام دیا جانا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اِسی طرح اگر ہمارے امام ہمام ایدہُ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کے لئے موجودہ ہجرت مقدّر نہ ہوتی تو اِس وقت جو جلد جلد عالمی ترقیات جماعت کو حاصل ہو رہی ہیں پاکستان میں اس کا حصُول مشکل تھا۔ فرمانِ خداوندی ہے

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً

جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں وہ زمین میں بہت ہی فراوانی و وسعت پاتے ہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اِس شمارے میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم ومغفور کے حالات اور آپ کے کارناموں کی ایک مختصر جھلک اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کریں۔ اُمید ہے قارئین اِس کوشش کو پسند فرمائیں گے۔ اور محترم ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کی بلندئ درجات کے لئے دُعائیں کریں گے۔

(مُنیر احمد خادم)

آئی۔سی۔ٹی۔پی

ایک غمگُسار دل کا مُنجمد لہُو!

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم نے ۱۹۶۴ء میں تیسری دُنیا کے غریب ممالک کے سائنسدانوں کی اعلیٰ تربیت کیلئے اٹلی کے شہر ٹریسٹے میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل ریسرچ فزکس کے نام سے ایک سنٹر قائم فرمایا جو آج تک بلالحاظ مذہب وملت و رنگ ونسل کئی نونہالوں کو دولتِ سائنس سے مالا مال کر چکا ہے اور وہ دُنیا میں عظیم خدمات کر رہے ہیں۔
آئی۔سی۔ٹی۔پی کو مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ یونیورسٹی کے مجلّہ تہذیب الاخلاق سے ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

"تاج محل سے کون واقف نہ ہوگا۔ مشرق کی یہ وہ نادر المثال یادگار ہے جس نے ہر چشمِ فکر پر ایک نیا عکس بنایا ہے اور جسے دیکھنے والا خراجِ تحسین پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سنگِ مرمر کے اِس تراشہ کے دِل کو چھُو لینے والے حُسن اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے جمال کا سرچشمہ دردِ عشق ہے جو تاج محل کی شکل میں مجسم ہو گیا ہے۔ ٹیگور کی زبان میں

"تاج محل ایک چشمِ عشق کا منجمد آنسو ہے۔"

آئی۔سی۔ٹی۔پی (انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس، ترئیستے اٹلی) ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جس کا بُنیادی مقصد تیسری دُنیا کے ممالک میں سائنسی علوم کا فروغ ہے۔ یہاں دنیا کے کونے کونے سے ترقی یافتہ و پسماندہ ممالک کے سائنسداں مختصر مدت کیلئے علم کی پیاس بجھانے آتے ہیں۔ کچھ سیکھتے ہیں کچھ سکھاتے ہیں۔ پھر نئے خیالات و نئے رجحانات کی مَے سے سرشار واپس لوٹ کر اپنے اپنے ممالک کی تعمیر و ترقی میں لگ جاتے ہیں۔ فی الحقیقت آئی۔سی۔ٹی۔پی ایک ادارہ نہیں انسانی برادری کے وحدت کے خواب کی زندہ تعبیر ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں امیر وغریب۔ رنگ ونسل۔ مذہب وقومیت کی ساری حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں مُسلمان عیسائی کو گلے لگاتا ہے۔ گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکی سرمایہ دار کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس ادارے نے دانستہ و نادانستہ طور پر پسماندہ ممالک میں سائنسی علوم کو پھیلانے میں کیا اہم رول ادا کیا ہے اس کا صحیح اندازہ تو آنے والا مؤرخ ہی کرے گا۔ البتہ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس ادارے نے پسماندہ ممالک میں سائنس کی ایک لہر پیدا کر دی ہے جو ہر آن بڑھتی جا رہی ہے۔

تاج کی طرح آئی۔سی۔ٹی۔پی بھی ہر چشمِ بینا سے خراجِ عقیدت وصُول کر رہا ہے۔ اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر میں قائم اِس ادارے کے جمالِ لیلیٰ علم و نورِ شمعِ انسانیت کا سرچشمہ ایک حسّاس اور دردمند انسان کا خونِ جگر ہے۔ سچ تو یہ ہے:-

آئی۔سی۔ٹی۔پی ایک غمگُسار دل کا منجمد لہو ہے۔

اور وہ غمگُسار دِل سائنس کے اس تاج محل کے شاہ جہاں محمد عبدالسلام کے علاوہ کس کا ہو سکتا ہے جو صرف کائنات کے رازِ سربستہ سے سرگوشی ہی نہیں کرتے بلکہ تیسری دُنیا خصوصاً عالمِ اسلام کی حالتِ زار پر اشکِ خُوں بھی بہاتے ہیں۔"

(ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جنوری ۸۶ء ۱۹)

نوبل انعام کی عظیم الشان ضیافت کے موقع پر ڈاکٹر عبدالسلام مرحوم کی تقریر

اعلیٰ حضرت، فضیلت مآب خواتین و حضرات

مَیں اپنے ساتھیوں پروفیسر گلاشئو اور وائن برگ کی جانب سے نوبل فاؤنڈیشن اور رائل اکاڈمی آف سائنسز کا، ہمیں عطا کئے گئے اعزاز اور فیاضیوں کے ساتھ مجھے اپنی زبان اُردو میں تخاطب کے لئے عطا کی گئی اجازت کے لئے مشکور ہوں۔

پاکستان اس کے لئے آپ کا بہت مشکور ہے

علمِ طبیعیات کی تخلیق تمام نوعِ انسانی کی مشترکہ وراثت ہے، مشرق و مغرب اور شمال و جنوب نے مساوی طور پر اس میں تعاون دیا ہے! اسلام کی الہامی پاک کتاب قرانِ پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ

"تجھے رحمٰن مطلق کی تخلیق میں کوئی خامی نظر نہیں آتی ہے۔ اس کو بہ نظرِ غائر دیکھ کیا کوئی شگاف نظر آتا ہے۔ بار بار نظر ڈال کر تیری بصارت خیرہ اور پریشان واپس آتی ہے۔"

دراصل تمام ماہرین طبیعیات کا یہ ایمان ہے کہ جتنا گہرائی تک ہم سوچیں گے اتنی ہی ہماری حیرانی فزوں ہوگی، اتنی ہی ہماری نگاہ میں خیرگی ہوگی۔

مَیں یہ بات صرف ان کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں جو آج رات یہاں موجود ہیں بلکہ ان کو بھی یاد دلا رہا ہوں جو تیسری دُنیا کے ہیں۔ اور محسوس کرتے ہیں کہ وسائل اور مواقع کی کمی کی خاطر وہ سائنسی علوم کی جستجو میں کھو چکے ہیں۔

الفریڈ نوبل نے صاف صاف واضح کر دیا تھا کہ اس کی سخاوت سے فیضیاب ہونے میں کسی رنگ و نسل کی تفریق کارفرما نہیں ہوگی۔

اس موقعے پر مَیں یہ بات ان سے کہنا چاہتا ہوں جنھیں خداوند کریم نے اپنی فیاضیوں سے نوازا ہے۔ ہمیں سب کو برابر مواقع فراہم کرنے کی جدّوجہد کرنی چاہیئے تاکہ ہم بھی طبیعیات اور سائنس کی تخلیق میں لگ کر نوع انسانی کی بہتری میں تعاون دے سکیں۔ یہ الفریڈ نوبل کی نیت کے مطابق ہوگا اور ان نظریات کا حامل ہوگا جو اس کی زندگی میں سرایت کر گئے تھے۔

آپ پر سلامتی ہو!

"نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد

جب مجھے پاکستان مدعو کیا گیا تو مَیں نے پیشکش کی تھی کہ میرے انعام کی رقم سے اور کچھ سرکاری سرمائے سے ایک "سائنس فاؤنڈیشن" قائم کی جائے جو طلبائے سائنس کو وظائف اور انعامات دیا کرے افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا لیکن مَیں نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنے انعام کی رقم سے از خود ایک فاؤنڈیشن قائم کر دی مجھے احساس ہے کہ ساٹھ ہزار ڈالر کی رقم کچھ بھی نہیں ہے لیکن کچھ نہ کچھ ہونا بالکل نہ ہونے سے بہتر ہے کچھ طلباء تو اس سے مستفید ہو رہے ہیں سال میں پچاس طلباء۔ گزشتہ برس ہم نے ایک خاتون ماہرِ طبیعیات کو بھی ایک ہزار ڈالر کا انعام دیا اس سال خاتون ریاضی دان کی باری آئے گی۔ اسی طرح جب مجھے "ایٹم برائے امن" کا انعام ملا تو مَیں نے وہ رقم جھنگ، ساہیوال اور لاہور کے بعض سکولوں اور کالجوں میں لیبارٹری بڑھانے پر وقف کر دی۔ میرا ایک کام نتھیا گلی سمر سکول برائے طبیعیات کا قیام ہے یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا منفرد سکول ہے جسے میں نے ۱۹۷۶ء میں قائم ہونے میں مدد دی تھی۔" (پروفیسر عبدالسلام)

پروفیسر عبدالسلام ۱۹۷۹ء میں نوبل میڈل حاصل کرتے ہوئے

ہمارے دَور میں، مغرب کے علم و دانش سے
بشر کو نُور مِلا، زیست کو شعور مِلا
ہمارے دَور میں مشرق کے مے فروشوں کو
مِلا تو بادہ دوشینہ کا سرور مِلا
کِسی کی فکر نے فطرت کے راز فاش کئے
کِسی کو ماضیٔ گم گشتہ پر غرور مِلا

سلام تجھ پہ، ترے ذوقِ آگہی کے طفیل
دیارِ شرق کا دیدہ وری میں نام ہوا
وہ کم طلب جو گریزاں تھا بزمِ عرفاں سے
تری کشش سے بالآخر شریکِ جام ہوا
عمیق بحر کی موجوں سے کر کے سرگوشی
فضا میں ہر نئے سورج سے ہم کلام ہوا

یہ جُستجو، یہ متاعِ نظر ہی سب کچھ ہے
یہ تازہ کاریِ زخمِ جگر ہی سب کچھ ہے
سوال کرتے رہے تو جواب بھی ہوں گے
یہ سوز و ساز یہ سعیِ بشر ہی سب کچھ ہے

آل احمد سرور

پروفیسر عبدالسلام کے اعزاز میں علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کے مرکز فروغ سائنس کے زیرِ اہتمام منعقد کئے گئے ایک جلسہ میں پڑھی گئی۔ (بشکریہ: خواب اور حقیقت)

احمدی سائنسدان کے
مختصر حالاتِ زندگی اور عظیم کارنامے

محمود مجیب اصغر

خاندانی حالات

ڈاکٹر عبدالسلام کا تعلق دریائے چناب کے کنارے واقع جھنگ شہر کے ایک گھرانے سے ہے۔ ان کے والد کا نام چوہدری محمد حسین اور والدہ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ ان کے آباؤ اجداد پاک و ہند کے راجپوت خاندان کے شہزادوں میں سے تھے۔ جولائی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو کئی بزرگ اسلام کی تبلیغ کے لئے اس ملک میں داخل ہوئے ان میں ایک بہاؤالدین زکریاؒ[1] بھی تھے جو ملتان کے علاقہ میں آئے اُس وقت یہاں اکثر لوگ ہندو تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے جدّ امجد سعد بڈھن حضرت غوث بہاؤالدین زکریاؒ کی تبلیغ سے مسلمان ہوگئے۔ انہوں نے اپنی باقی عمر اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ان کی وفات ملتان میں ہوئی اور وہیں حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے اسلام کی تبلیغ کے لئے اپنے مریدوں کے ذمے مختلف علاقے کئے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بزرگوں کے ذمہ جھنگ کا علاقہ کیا گیا اس طرح یہ خاندان جھنگ آکر آباد ہوگیا اور وہاں اسلام کی تبلیغ کرتا رہا۔ ان کے بزرگوں کو اس سلسلے کا خلیفہ کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد مرحوم بیان کرتے ہیں :۔

> "میں نے اپنے دادا حضرت میاں قادر بخش مرحوم اور اپنے والد حضرت میاں گل محمد مرحوم کو خلافت پر متمکن دیکھا..... میرے والد میاں گل محمد رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کے بڑے اچھے عالم تھے ..... والدہ ماجدہ تہجد گذار عورت تھیں"[2]

غرض مدتوں سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا خاندان دیندار چلا آرہا ہے۔ سیدنا حضرت اقدس مولانا نورالدینؓ کے زمانۂ خلافت میں اس خاندان کو احمدی ہونے کی برکت ملی۔

ان کے والد چوہدری محمد حسین مرحوم کے احمدی ہونے کا واقعہ یوں ہے کہ جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو ایک شخص نے احمدیت کی مخالفت میں ایک انجمن بنائی اور انہیں اس میں شامل ہونے کو کہا۔ انہوں نے کہا کہ اگر حضرت مرزا غلام احمد قادیانیؑ سچے ہوئے تو پھر؟ اس شخص نے کہا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس پر انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے سورۃ فاتحہ کی دُعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (یعنی اے اللہ مجھے سیدھا راستہ دکھا) کرنی شروع کر دی۔ ایک رات انہیں حضرت خلیفہ اوّلؓ کی خواب میں زیارت ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ یہی وہ بزرگ ہیں جن کی آپ کو تلاش ہے۔ چنانچہ چوہدری محمد حسین صاحب نے قادیان جاکر حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اگرچہ اس سے پہلے اُن کے بڑے بھائی چوہدری غلام حسین صاحب اور والدہ احمدی ہو چکے تھے تاہم ان کی بہت مخالفت ہوئی لیکن وہ اپنے ایمان پر مضبوطی سے جمے رہے۔ احمدی ہونے کے اٹھارہ دن بعد حضرت مولانا نورالدین خلیفہ اوّلؓ فوت ہوگئے اور حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد خلیفہ ثانی ہوئے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے والد چوہدری محمد حسین صاحب کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ حضرت خلیفہ ثانی نے انہیں زمانۂ طالبعلمی میں ہی احمدیہ ہوسٹل لاہور کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کر دیا تھا اس وقت وہ بی۔اے میں پڑھتے تھے۔

بی۔اے کے بعد ۱۹۲۰ء میں وہ گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ میں عارضی اُستاد لگ گئے اور بعد میں محکمہ تعلیم میں ہیڈ کلرک ہوگئے۔

انہی دنوں ان کی شادی ہوئی۔ ان کی بیوی کا نام سعیدہ بیگم تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۲ء کو ان کے ہاں بیٹی ہوئی جس کا نام مسعودہ بیگم رکھا گیا۔ بیٹی کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کی بیوی وفات پاگئیں چوہدری محمد حسین صاحب نے اس کے بعد تین سال بڑی مصیبت میں گذارے۔ چھوٹی سی بچی کو وہ خود پالتے رہے۔ اس دوران انہوں نے خدا تعالیٰ سے بہت دعائیں کیں۔

عبدالسلام کی پیدائش اور ابتدائی حالات

پہلی بیوی کی وفات سے تین سال بعد چوہدری محمد حسین صاحب کا رشتہ حافظ نبی بخش صاحب پٹواری کی بیٹی محترمہ ہاجرہ بیگم صاحبہ سے طے ہوا۔ اس رشتہ کے لئے حضرت خلیفہ ثانیؓ نے اجازت عطا فرمائی اور مسجد مبارک قادیان میں خود یہ نکاح پڑھا اور بہت لمبی دُعا کروائی۔

۱۲ مئی ۱۹۲۵ء کو شادی ہوئی اور شادی کے ایک ہفتہ بعد دُلہن اپنے والدین کے پاس سنتوکھ داس ضلع ساہیوال چلی گئیں جہاں ان کے والد صاحب ملازم تھے۔

۳ جون ۱۹۲۵ء کو انگلستان کے بادشاہ کا یوم پیدائش تھا۔ چوہدری محمد حسین صاحب مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد احمدیہ جھنگ گئے۔ مغرب کی سنتیں ادا کرتے ہوئے قیام کی حالت میں وہ قرآن کریم کی یہ دُعا کر رہے تھے :۔

> رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا۔ (الفرقان : ۷۵)
>
> یعنی اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

اس دوران اُن پر کشفی حالت طاری ہوئی اور ایک فرشتہ ظاہر ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک معصوم بچہ تھا فرشتے نے وہ بچہ چوہدری محمد حسین صاحب کو پکڑایا اور کہا کہ اللہ کریم نے آپ کو بیٹا عطا فرمایا ہے۔ انہوں نے اس بچے کا نام پوچھا تو آواز آئی

"عبدالسلام"

یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے زبردست بشارت تھی۔ چوہدری صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک خط لکھ کر اپنی بیوی کو اس کشف سے آگاہ کیا۔

خدائی بشارتوں کے مطابق یہ بچہ ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء جمعہ کے روز سنتوکھ داس میں پیدا ہوا۔ بچے کی پیدائش پر چوہدری محمد حسین صاحب نے حضرت خلیفہ ثانیؓ کو نام رکھنے کے لئے خط لکھا تو حضور نے فرمایا

"جب خدا تعالیٰ نے خود نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں"

چنانچہ اس بچے کا نام عبدالسلام ہی رکھا گیا۔

عبدالسلام کے والدین بڑے سمجھدار اور دعائیں کرنے والے تھے انہوں نے خدائی بشارتوں کے ماتحت پیدا ہونے والے اس بچے کی اچھی طرح پرورش کی۔ بچے کی صحت کا خیال رکھا اور اس کے لئے بہت دعائیں کیں۔

جُوں جُوں عبدالسلام بڑے ہو رہے تھے باپ کی دُعائیں بیٹے کے حق میں پُوری ہو رہی تھیں اور خدا تعالیٰ ان کے مستقبل کے بارے میں خبریں دے رہا تھا۔ چوہدری محمد حسین صاحب لکھتے ہیں :۔

> "ایک روز عزیز سخت بیمار ہو گیا جان کا بھی خطرہ محسوس ہوا۔ بہت دعا کی تو خواب میں عزیز ایک اچھے خاصے قد والا جوان دکھایا گیا"[1]

گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے والد صاحب کو ان کی صحت اور لمبی عمر پانے کی خبر دی۔ ان بشارتوں سے ان کے والدین جہاں خوش ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے وہاں اپنے بیٹے کی صحت اور پرورش پر زیادہ توجہ دیتے دعائیں کرتے اور حضرت صاحب کو بھی دعاؤں کے لئے لکھتے رہتے۔

عام طور پر بچے جس عمر میں بولنا شروع کرتے ہیں عبدالسلام اس عمر کو پہنچ گئے لیکن ابھی بولتے نہ تھے اُن کے والدین نے ایک احمدی بزرگ حضرت مولوی غلام رسول صاحب راجیکیؓ سے دعا کروائی اور وہ بولنے لگ گئے۔ چنانچہ ان کے والد صاحب بیان کرتے ہیں :۔

> "ایک مرتبہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ چند روز ہمارے گھر پر جھنگ شہر میں مہمان رہے۔ عزیز عبدالسلام کی عمر اس وقت چھوٹی تھی اور وہ بولتا نہ تھا جس کا اس کی ماں کو سخت احساس تھا۔ حضرت مولوی صاحب کے پاس عزیز سلام سلمہ کو لے جا کر شکایت کی کہ یہ بولتا نہیں دعا فرماویں۔ مولوی صاحب نے بڑی محبت کے لہجے میں عزیز سے خطاب کیا اور کہا
>
> "او گونگو کیوں نہیں بولتا"
>
> اور فرمانے لگے کہ انشاء اللہ یہ اتنا بولے گا کہ دُنیا سُنے گی"[2]

ان کے والد صاحب بیان کرتے ہیں کہ "لطف یہ ہے کہ جوان ہو کر عزیز نے (ریڈیو پر) ایک ایسی تقریر کی کہ ساری دُنیا میں سنائی گئی ہے"

فوراً مولوی صاحب کی دُعا سے عبدالسلام نے بولنا شروع کر دیا۔

ابتدائی تعلیم اور شاندار کامیابیاں

عبدالسلام نے اپنی تعلیم گھر میں ہی شروع کی۔ ان کی والدہ نے اللہ کا نام لے کر انہیں الف ب شروع کروائی اور جلد ہی وہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گئے۔ بہت چھوٹی عمر میں انہوں نے قرآن کریم بھی پڑھا اور اس کا ترجمہ سیکھا۔

بچپن میں اُن کے والد انہیں آسان اخلاقی کہانیوں کی کتابیں اور رسالے لا کر دیتے جنہیں وہ بڑی دلچسپی سے پڑھتے۔ ان کے والد انہیں نئی نئی اور دلچسپ کہانیاں سُناتے اور پھر اُن سے وہی کہانی سُنتے۔ اس طرح اُن کا حافظہ بڑھتا گیا اور پڑھائی کا شوق پیدا ہوتا رہا۔ جب وہ ساڑھے چھ سال کے ہوئے تو اُن کے والد انہیں سکول داخل کروانے کے لئے لے گئے۔ ہیڈماسٹر نے بچے کی قابلیت دیکھ کر انہیں سیدھا چوتھی جماعت میں داخل کیا۔

تھوڑی سی محنت کے ساتھ جلد ہی انہوں نے چالیس تک پہاڑے یاد کئے اور بہت ساری ضرب الامثال اور لمبے لمبے پیراگراف زبانی یاد کر لئے۔ ان کی ذہنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے لئے ان کے والد انہیں مختلف مشینوں کے انجن، موٹر کار، سائیکل، دریا کا پُل اور دریا کا بند دکھانے کے لئے باہر لے جاتے اور ان کے استادوں کو بھی مل کر اُن کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دیتے اور انہیں سکول کے رسالہ کے لئے مضمون لکھنے کو کہتے۔ اس طرح عبدالسلام کو بچپن سے ہی علم سے محبت پیدا ہو گئی اور وہ بڑی توجہ اور محنت سے پڑھنے لگ گئے۔ اُن کی ایک بہن کہتی ہیں :۔

> "بھائی جان بچپن سے ہی اپنی تعلیم میں ایسے مصروف رہتے تھے کہ کبھی انہیں بیکار گپ شپ یا کھیل کود میں وقت ضائع کرتے نہیں دیکھا"

مطالعہ کی انہیں اتنی عادت تھی کہ کھانے کے دوران بھی پڑھتے رہتے۔ اُن کی بہن کہتی ہیں :۔

> "کھانا کھا رہے ہیں چوکی پر روٹی سالن پڑا ہے اور خود پیڑھی پر بیٹھے کھاتے ہوئے کوئی رسالہ بھی پڑھ رہے ہیں۔ مُرغی پلیٹ میں سے بوٹی نکال کر لے گئی ہے انہیں کچھ علم نہیں بعد میں علم ہوا کہ بوٹی تو مُرغی لے گئی ہے"

۱۹۳۴ء میں عبدالسلام نے جھنگ سنٹر سے چوتھی کا امتحان دیا اور اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس وقت عبدالسلام کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔

مارچ ۱۹۳۶ء کی ایک نمائش میں انہوں نے ڈپٹی کمشنر جھنگ سے خوشخطی پر اوّل انعام حاصل کیا۔ اسی طرح مارچ ۱۹۳۷ء کی ایک نمائش میں بھی انہوں نے نقشہ نویسی اور خوشخطی میں پہلا انعام جیتا[3]

عبدالسلام کی بچپن سے یہ عادت تھی کہ جو سبق اگلے روز سکول میں پڑھنا ہوتا وہ اسے گھر سے پڑھ کر جاتے اور بڑی توجہ اور محنت سے پڑھتے۔ ان کی محنت کا پھل انہیں شروع سے اوّل آنے کی شکل میں ملتا رہا۔

۱۹۳۸ء میں انہوں نے مڈل پاس کیا اور ضلع بھر میں اوّل آئے اور چھ روپے ماہوار وظیفہ حاصل کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ انہی دنوں جھنگ میں ایک تقریب میں ڈپٹی کمشنر کی صدارت میں سلام نے ایک مضمون پڑھا مضمون سُن کر ڈی سی نے ان کے والد کو پیغام بھیجا کہ اس لڑکے کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دیں۔

مڈل کے بعد وہ گورنمنٹ انٹر کالج جھنگ میں داخل ہوئے اور سائنس اور ریاضی کے مضمون رکھے۔ ان کی قابلیت کی وجہ سے انہیں کلاس کی لائبریری کا انچارج بنا دیا گیا جہاں انہوں نے بہت کتابیں پڑھیں۔ ان کا مقابلہ کچھ غیرمسلم طالب علموں سے رہتا تھا لیکن سلام نے کبھی انہیں آگے بڑھنے نہیں دیا۔ ان کے والد ان کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہتے۔ ۱۹۴۰ء میں سلام نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں نہ صرف اوّل آئے بلکہ ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔ گورنمنٹ کی طرف سے سلام کو بیس روپے ماہوار وظیفہ ملا اور کالج کی طرف سے انہیں خالص سونے کا میڈل دیا گیا۔

میٹرک کا نتیجہ نکلنے سے پہلے سلام کے والد صاحب کو خواب میں شربت پلایا گیا جس کی تعبیر سلام کی اعلیٰ کامیابی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

بچپن میں سلام نہ صرف پڑھائی میں لائق تھے بلکہ اور بھی بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔ چھوٹی عمر سے نمازوں کے پابند تھے اور وقت بالکل ضائع نہیں کرتے تھے۔ گالی گلوچ سے پرہیز کرتے تھے اور اپنے ماں باپ، اُستادوں اور سب بزرگوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی ایک بہن محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ ان کے بچپن کے بارہ میں بیان کرتی ہیں :۔

> "بھائی جان کو کبھی اُونچی آواز میں بات کرتے یا کسی سے گالی گلوچ کرتے نہیں دیکھا۔ والدین اور بزرگوں کا بے حد احترام کرتے۔ ابّا جان کے ایک لاولد چچا تھے بھائی جان نے ان سے بہت دُعائیں لیں۔
>
> بھائی جان کا پسندیدہ کام یہ تھا کہ جمعہ کے دن مسجد احمدیہ میں صفائی کرنی اور ہمیشہ مغرب سے پہلے مسجد جا کر اذان دینی۔
>
> سادگی بچپن سے ہی طبیعت میں بھری ہوئی تھی۔ بچپن میں گھر کے دُھلے ہوئے کپڑے پہنتے کبھی انہیں اس فیشن میں نہیں دیکھا کہ جب تک اچھے کپڑے نہ ہوں باہر نہیں جانا۔ جو ملا پہن لیا۔
>
> خوراک کے معاملہ میں والدین کو ہم سب کا بہت خیال رہتا تھا۔ الاپ شناپ یا ریڑھی چھابوں وغیرہ سے کبھی کوئی چیز لے کر کھانے کی عادت نہ ڈالی تھی۔ ابّا جان نے بازاری چیزوں سے ہمیں ایسا پرہیز بتایا ہوا تھا کہ کوئی بھی کبھی باہر سے لا کر کچھ نہ کھاتا تھا اور نمونہ ہمارے بھائی جان تھے"[1]

اس کے علاوہ عبدالسلام میں بچپن سے حسد کی عادت بالکل نہ تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا حافظہ بہت اچھا رہا۔ وہ اپنی صحت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بچپن میں انہوں نے اعلیٰ صحت پر ایک جلسہ میں ڈپٹی کمشنر جھنگ سے چاندی کا پیالہ بطور انعام حاصل کیا۔[2]

سلام اپنی چیزوں اور کتابوں کو ہمیشہ احتیاط اور ترتیب سے رکھتے تھے۔ سکول باقاعدگی سے جاتے تھے کبھی ناغہ نہ کرتے تھے۔ اگلے ڈیسک پر بیٹھ کر توجہ سے سبق سُنتے اور گھر آکر ضرور دوہراتے اور کتابوں کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے۔ ایف۔اے میں بھی سلام نے ریاضی اور سائنس کے مضامین رکھے اور برابر محنت کرتے رہے۔ بارھویں میں اپنے کالج کے رسالہ "چناب" کے ایڈیٹر رہے۔ انہیں مضمون لکھنے کا بہت شوق تھا اور ان کے والد ان کی اس بارہ میں رہنمائی کرتے اور ان کے بعض مضمون جھنگ کے علمی حلقہ میں ماہرین کو دکھاتے اور ان سے مشورہ لیتے اور ان کے پرنسپل کو بھی مشورہ دینے کے لئے کہتے۔

عبدالسلام بڑے محنتی اور ذمہ دار طالب علم تھے ان کی والدہ بیان کرتی ہیں :۔

> "سلام جب سائنس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا تو روز رات کو کہتا کہ امی مجھے پڑھنا ہے آپ صبح سویرے چار بجے ضرور اُٹھا دیں اور میں چار بجے ساڑھے چار بجے اسے اُٹھانے کے لئے جاتی تو وہ پہلے ہی سے جاگ گیا ہوتا اور اپنی پڑھائی میں مصروف نظر آتا تھا کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ مجھے سویرے سوتے ہوئے ملا ہو اور مجھے اسے جگانا پڑا ہو۔ نہ معلوم وہ کب اور کتنے اندھیرے سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ اسے بچپن ہی سے علم سے محبت تھی اور ہمیشہ پڑھائی میں اوّل آتا رہا"[3]

۱۹۴۲ء میں عبدالسلام نے ایف۔اے کیا۔ ۸۵ فیصدی نمبر لے کر صوبے بھر میں نہ صرف اوّل آئے بلکہ نیا ریکارڈ قائم کیا اور ۳۰ روپے ماہوار وظیفہ حاصل کیا۔ کالج کی طرف سے انہیں خالص سونے کا میڈل بطور انعام دیا گیا۔

سلام نے یہ سب کامیابیاں ایک ایسے گھر میں رہ کر حاصل کیں جو کہ بہت چھوٹا تھا۔ اس میں بجلی بھی نہ تھی۔ چھوٹے بہن بھائی بھی کافی تھے گھر میں شور بھی ہوتا ہوگا لیکن سلام ان حالات میں نہ صرف خود اعلیٰ کامیابیاں حاصل کرتے رہے بلکہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی بھی تعلیم میں مدد کرتے اور خود رات کی خاموشی میں دیا جلا کر محنت کرتے۔ ان کی چھوٹی بہن کا بیان ہے :۔

---

[1] یہ وہی بزرگ ہیں جن کے نام پر ملتان میں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی بنی اسی نے ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر سلام کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔

[2] سرگذشت

[1] سرگذشت

[1]، [2] سرگذشت

[3] Biographic Sketch of Prof. Abdus Salam by Dr. A. Ghani.

[1] خط بنام خاکسار مرقومہ ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ء

[2] بحوالہ سرگذشت

[3] "مشرق" لاہور ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء ص ۳

"گھر میں بجلی نہ تھی شام کو اُن کے لئے لیمپ میں مٹی کا تیل بھرنا اور ایک بوتل بھر کر اُن کی چارپائی کے نیچے رکھنا میری ڈیوٹی ہوتی تھی۔ رات کو اکثر تین بجے پڑھنے کے لئے اُٹھ جاتے تھے اُس وقت انہوں نے دوبارہ تیل بھر کر پڑھائی شروع کرنی اور صبح ہمارے اُٹھنے سے پہلے آرام کے لئے لیٹ جاتا۔ اکثر وہ رات کی خاموشی میں پڑھتے تھے۔" [1]

اِسی طرح ان کی بہن کہتی ہیں:۔

"چھوٹے بہن بھائیوں سے پیار سے بولنا، تعلیم میں اُن کی مدد کرنی لیکن اِس رنگ میں نہیں کہ انہیں کام کر کے دے دینا۔ کہنا خود کر کے لے آؤ جو سمجھ نہ آئے میں بتا دوں گا۔" [2]

۱۹۴۲ء میں ایف۔اے کرنے کے بعد سلام گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اُس وقت وہ سولہ سال کے تھے اُن دنوں اُن کے والد محکمہ تعلیم میں ملتان ہوتے تھے اِس لئے انہیں لاہور ہوسٹل میں رہنا پڑا جہاں انہیں شطرنج کھیلنے کی عادت پڑ گئی۔ ان کے مسلمان دوستوں کو ڈر پیدا ہُوا کہ کھیل میں وقت ضائع کرنے کی وجہ سے سلام کہیں ہندو اور سکھ لڑکوں سے پیچھے نہ رہ جائے اِس لئے انہوں نے ان کے والد کو ملتان خط لکھا اور سلام کی شکایت کی۔ سلام کے والد ناراض ہوئے اور بیٹے کو شطرنج میں وقت ضائع کرنے سے منع کیا۔ چنانچہ سلام فوراً رُک گئے اور زیادہ محنت سے پڑھنے لگے وہ اپنے کمرے میں اپنے آپ کو بند کر لیتے اور باہر دروازے پر تالا لگوا دیتے اور چودہ چودہ گھنٹے مسلسل پڑھتے رہتے۔ کتابیں ترتیب سے رکھتے۔ ان کی بہن کہتی ہیں کہ جب لاہور چلے گئے تو وہاں سے لکھ دیتے فلاں الماری میں فلاں حصہ میں یہ کتاب رکھی ہے بھجوا دیں۔ [1]

۱۹۴۴ء میں سلام نے بی۔اے آنرز کیا اور ہر مضمون میں اوّل آئے اور ۹۰ ½ فیصد نمبر لے کر نیا ریکارڈ قائم کیا اور سونے اور چاندی کے میڈل لئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ کالج کے رسالے کے چیف ایڈیٹر اور کالج یونین کے صدر رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے ریاضی پر تحقیقی مقالہ بھی لکھا۔

۱۹۴۶ء میں سلام نے اِسی کالج سے ریاضی میں ایم۔اے کیا اور ۹۵ ½ فیصد نمبر لے کر نہ صرف یونیورسٹی میں اوّل آئے بلکہ پچھلے تمام ریکارڈ توڑ کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔

غرض عبدالسلام سکول سے ایم۔اے تک ہر امتحان میں اوّل آتے رہے اور اس دَوران کُل سات میڈل حاصل کئے۔

سکول اور کالج کی پڑھائی کے دَوران وہ باقاعدہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے حضرت محمدؐ رسول اللہ کی حدیثیں پڑھتے اور حضرت مسیح موعودؑ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے۔

ریاضی کے علاوہ انہیں تاریخ اِسلام، فلاسفی، اکنامکس اور پولیٹکل سائنس سے بھی دلچسپی تھی اور کئی کتابیں پڑھ کر انہوں نے ان علوم میں مہارت پیدا کی۔

جماعتی وظائف واعزازات عبدالسلام کے والد صاحب کی آمدنی بہت تھوڑی تھی اور گھر کے افراد زیادہ تھے تاہم اللہ تعالیٰ سلام کی پڑھائی کے لئے خود اِنتظام فرماتا رہا۔ قابلیت کی بِنا پر انہوں نے امام جماعتِ احمدیہ سے بھی وظیفے حاصل کئے چنانچہ اُن کے والد صاحب بیان کرتے ہیں:۔

"دسمبر ۱۹۳۹ء میں سر چوہدری محمد ظفراللہ خاں... نے جماعتِ احمدیہ میں ۲۵ سال خلافتِ ثانیہ کے گذرنے پر جوبلی فنڈ کی تحریک کی اور تین لاکھ روپیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو پیش کیا۔ حضور نے ..... جلسہ سالانہ ۱۹۳۹ء میں اِعلان فرمایا کہ نوجوانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے اِعلان کرتا ہوں کہ

- جو طالبِ علم جماعتِ احمدیہ کا اپنے سکول میں اوّل آئے گا اُسے اِس فنڈ سے ۲۰ روپے ماہوار کا وظیفہ ایف۔اے کے دو سال میں دیا جائے گا۔
- پھر جو ایف۔اے میں اوّل آئے گا اُسے ۴۵ روپے ماہوار (وظیفہ) بی۔اے کلاسوں میں دیا جائے گا۔
- ازاں بعد جو بی۔اے میں اوّل آئے گا اُسے ایم۔اے کلاسز میں دو سال ۶۰ روپے ماہوار وظیفہ دیا جائے گا۔
- ایم۔اے کرنے کے بعد جو لڑکا مغرب کی کِسی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جائے گا اُسے نصف خرچ اِس فنڈ سے دیا جائے گا۔" [3]

اسی شام ملاقات کے دَوران سلام کے والد صاحب نے حضور کو بتایا کہ سلام یہ سب وظیفے لے گا چنانچہ ایسے ہی ہُوا۔ ۱۹۴۹ء میں حضور نے سلام کے خطبہ نکاح کے دَوران فرمایا:۔

"ہر باپ اپنے بیٹے کی تعریف کرتا ہے عزیز (سلام) کے والد نے بھی ایسی توقعات کا اظہار کیا تھا الحمدللہ عزیز (سلام) نے ان سب کو پُورا کرنے کی توفیق پائی۔" [4]

[1] [2] سرگذشت

[3] خط بنام خاکسار ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ء

عبدالسلام کا پاکستان میں شاندار تعلیمی ریکارڈ [5]

اِمتحان	سنہ	مضامین	حاصل کردہ نمبر	پوزیشن	وظائف
مڈل	[illegible]ء	سائنس وعربی	۸۸ ¾٪	ضلع جھنگ میں اوّل	۲ روپے ماہوار (گورنمنٹ کا وظیفہ)
میٹرک	۱۹۴۰ء	سائنس وعربی	۹۰٪	پنجاب یونیورسٹی میں اوّل (نیا ریکارڈ قائم کیا)	۲۰ روپے ماہوار (گورنمنٹ کا وظیفہ)... ۲۰ روپے ماہوار (جماعتِ احمدیہ کا وظیفہ)
ایف۔اے	۱۹۴۲ء	فزکس، ریاضی، عربی	۹۲ ½٪	پنجاب یونیورسٹی میں اوّل	۳۰ روپے ماہوار (گورنمنٹ کا وظیفہ) ۴۵ روپے ماہوار (جماعتِ احمدیہ کا وظیفہ)
بی۔اے	۱۹۴۴ء	ریاضی اے بی کورس، انگریزی آنرز	۹۰ ½٪	پنجاب یونیورسٹی میں اوّل، نیا ریکارڈ ہر مضمون میں اوّل	۶۰ روپے ماہوار (گورنمنٹ کا وظیفہ) ۶۰ روپے ماہوار (جماعتِ احمدیہ کا وظیفہ)
ایم۔اے	۱۹۴۶ء	ریاضی	۹۵ ½٪	پنجاب یونیورسٹی میں اوّل (نیا ریکارڈ قائم کیا)	۵۵۰ روپے ماہوار (بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لئے گورنمنٹ کا وظیفہ)

اعلیٰ تعلیم اور حیران کُن کامیابیاں

عبدالسلام اب اعلیٰ نمبروں میں ایم۔اے کر چکے تھے۔ ان کے والدین کی خواہش تھی کہ اُن کا بیٹا مقابلے کا امتحان دیکر ڈپٹی کمشنر بنے لیکن اُن دنوں دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے مقابلے کا اِمتحان ملتوی ہو گیا۔ سلام کے دل میں بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن والد صاحب کی تھوڑی آمدنی کی وجہ سے بیرونِ ملک جانا ممکن نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ جو ہر چیز پر قادر ہے اُس نے اِس ناممکن بات کو اِس طرح ممکن بنا دیا کہ ۱۵ لاکھ روپے کی رقم جو ایک مشہور زمیندار خضر حیات ٹوانہ نے جنگِ عظیم میں انگریزوں کی مدد کے لئے اکٹھی کی تھی وہ ۱۹۴۵ء میں جنگ بند ہونے کی وجہ سے بچ گئی اور ۱۹۴۶ء میں انہوں نے پنجاب کا وزیرِ اعظم بن کر اس رقم میں سے چھوٹے زمینداروں کے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفے دینے کا اِعلان کر دیا۔ عبدالسلام کو اس فنڈ میں سے ۵۵۰ روپے ماہوار وظیفہ ملا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عبدالسلام وظیفہ لے کر انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ خدا کی قدرت کہ اس سے اگلے سال ہندوستان تقسیم ہو گیا اور عبدالسلام کے سوا اِس فنڈ سے کسی اَور کو وظیفہ نہ مل سکا۔

اکتوبر ۱۹۴۶ء سے عبدالسلام نے کیمبرج میں ریاضی کا تین سال بی۔اے آنرز کا کورس شروع کر دیا جسے ٹرائی پوز [6] کہتے ہیں۔ اِس کورس کے دَوران سلام روزانہ ۱۴ سے ۱۶ گھنٹے پڑھتے اور اپنے کورس کی کتابوں کے علاوہ تاریخی اور دینی کتابیں بھی پڑھتے عبدالسلام نے تین سال کا یہ کورس اوّل درجہ میں صرف دو سالوں میں کر لیا۔ جن دِنوں عبدالسلام یہ کورس کر رہے تھے اُن دنوں ہندوستان میں فسادات ہو رہے تھے اور ان کے عزیز و اقارب جن علاقوں میں رہتے تھے وہ بھی خطرے سے خالی نہ تھے لیکن انہوں نے بڑی ہمت اور محنت سے اپنی توجہ تعلیم کی طرف رکھی اور ۱۹۴۸ء میں بی۔اے آنرز (ریاضی) کی ڈگری حاصل کر لی۔

عبدالسلام ایک سال کا وظیفہ چھوڑ کر واپس آنا چاہتے تھے لیکن جب انہوں نے حضرت خلیفہ ثانیؓ کو مشورہ کے لئے خط لکھا تو حضور نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک یہ بُزدلی ہو گی اگر ملا ہُوا وظیفہ آپ چھوڑ کر واپس آتے ہیں۔ اس پر سلام نے ریاضی سے ملتے جُلتے مضمون فزکس میں داخلہ لے لیا۔ خلیفۂ وقت کی خواہش کا اِحترام کرنے کے لئے سلام نے ایسا قدم اُٹھایا جس میں کامیاب ہونا بظاہر ناممکن تھا کیونکہ ایک تو فزکس کا یہ کورس تین سال کا تھا اور وظیفہ ایک سال کا باقی تھا اور دوسرے فزکس کا مضمون انہوں نے ایف۔اے کے آگے پڑھا ہی نہیں ہُوا تھا لیکن ان کی محنت اور خلیفۂ وقت اور ان کے والدین کی دعاؤں نے کچھ ایسا اثر دکھایا کہ انہوں نے یہ کورس اوّل درجہ میں صرف ایک سال میں پاس کر لیا اور بی۔اے آنرز (فزکس) کی ڈگری حاصل کر لی۔

تین سال بعد ۱۹۴۹ء میں سلام واپس آئے اس دَوران ان کا نکاح اپنے تایا کی بیٹی امۃ الحفیظ بیگم سے ہُوا۔ نکاح حضرت خلیفہ ثانیؓ نے کوئٹہ میں پڑھا جہاں حضور گرمیوں میں گئے ہوئے تھے۔

کیمبرج سے بی۔اے آنرز کرنے کے بعد عبدالسلام پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے جس کے لئے اُن کے وظیفہ میں دو سال کی گورنمنٹ نے توسیع کر دی۔ ان کا وظیفہ ان کی بیوی کا خرچ برداشت کرنے کے لئے کافی نہ تھا اِس لئے وہ شادی کے بعد چھ ہفتے پاکستان رہ کر اکیلے واپس انگلستان چلے گئے اور پی ایچ ڈی فزکس کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔

یہاں سلام نے ایٹمی ذرات پر تحقیق کا آغاز کیا۔ ان کے ذمہ ایک ایسا کام لگایا گیا جس میں بڑے بڑے سائنسدان ناکام ہو چکے تھے اور جو طالبِ علم اس پر سلام سے پہلے کام کر رہا تھا وہ اُس مسئلہ کے حل کے لئے امریکہ کی اُس یونیورسٹی میں جا رہا تھا جہاں دُنیا کے چوٹی کے سائنسدان تحقیق کر رہے تھے۔ سلام نے تھوڑے سے وقت میں اس مسئلہ کو حل کر دکھایا جس پر انہیں ۱۹۵۰ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے سمتھ اِنعام دیا۔

سلام کا یہ تحقیقی مقالہ امریکہ کی اسی یونیورسٹی میں ایک مشہور سائنسدان ڈائسن کو پڑتال کے لئے بھجوایا گیا وہ خود اِس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام ہو چکے تھے اِس لئے انہوں نے جب سلام کا مقالہ پڑھا تو بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے ایڈنبرا لیکچر دینا تھا وہاں پہنچ کر انہوں نے سلام کو بھی ایڈنبرا بُلوا لیا اور ان سے لیکچر دلوایا۔

سلام سے زبانی سمجھ کر جب وہ ایڈنبرا سے واپس گئے تو انہوں نے واپسی پر مشہور سائنسدان رابرٹ اوپن ہیمر کے سامنے سلام کی بے حد تعریف کی اور بتایا کہ غیر ترقی یافتہ مُلک کا ہونے کے باوجود سلام غیر معمولی طور پر ذہین ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پی ایچ ڈی کا دوسرا سال گذارنے کے لئے پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ بُلوا لیا جہاں سلام کو دُنیا کے چوٹی کے سائنسدانوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس دَوران سلام کو اس صدی کے سب سے بڑے سائنسدان آئن سٹائن کو قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا جو اُن دِنوں کشش ثقل اور برقی مقناطیسی طاقتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور اِس طرح انہوں نے ایک سال کے لئے دُنیا کے چوٹی کے سائنسدانوں کے ساتھ کام کیا۔ تیسرا سال گذارنے کے لئے وہ کیمبرج آئے۔ مگر اب وظیفہ ختم ہو چکا تھا چنانچہ انہیں قابلیت کی بناء پر یہ رعایت دی گئی کہ وہ واپس پاکستان جا کر تیسرا سال وہیں ریسرچ کریں اور مقالہ وہیں سے بھیج دیں۔ یہ رعایت انہیں غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے دی گئی۔

کیمبرج چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اپنے نگران پروفیسر کو کہا کہ وہ انہیں ایک سرٹیفکیٹ دے دیں کہ "مَیں نے دو سال پی ایچ ڈی کا کام تسلی بخش کیا ہے۔" ان کے نگران پروفیسر جو اُن کی قابلیت سے بے حد متاثر ہو چکے تھے کہنے لگے "میرے خیال میں آپ مجھے ایک سند لکھ دیں کہ آپ نے میرے ساتھ کام کیا ہے۔"

غرض ۱۹۵۱ء میں سلام واپس پاکستان آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ ریاضی کے سربراہ لگ گئے۔ ایک سال بعد ۱۹۵۲ء میں انہوں نے تحقیقی مقالہ مکمل کر کے کیمبرج بھیجا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

زندگی کا نازک موڑ

اِنگلستان سے واپسی پر سلام کو امپیریل کالج لندن کے ایک مشہور پروفیسر لیوی نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو اِس کالج میں ملازم ہو جائیں لیکن سلام کے دِل میں خواہش تھی کہ وہ اپنے ملک پاکستان کی خدمت کریں اِس لئے انہوں نے اُس وقت پروفیسر لیوی کو اِنکار کر دیا اس کے باوجود پروفیسر لیوی نے انہیں کہا کہ اگر وہ کبھی اِنگلستان آنا چاہیں تو وہ امپیریل کالج میں انہیں لیکچرار لگوا دیں گے۔

پاکستان آ کر ڈاکٹر سلام نے کوشش کی کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ریسرچ کو ترقی دیں لیکن اِنتظامیہ نے ان کی مخالفت کی اور انہیں فٹ بال کلب کا صدر بنا دیا۔ اُن کی مخالفت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ وہ ایک مشہور سائنسدان [7] کی دعوت پر بمبئی گئے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے دن تھے انہوں نے وہاں جا کر ایک یورپی سائنسدان [8] سے تبادلہ خیال کیا اس جُرم کی سزا میں اُن کی تنخواہ کاٹ لی گئی اور ان کے پرنسپل کی رپورٹ پر انہیں گورنمنٹ کالج سے پنجاب یونیورسٹی لاہور تبدیل کر دیا گیا۔ تین سال وہ لاہور میں رہے اور اس دَوران وہ حالات کا مقابلہ کرتے رہے ان کا خیال تھا کہ جس طرح کسی مُلک کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے فوج ضروری ہے اسی طرح مُلک کی ترقی کے لئے سائنس پڑھنا ضروری ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ کو مشورہ دیا کہ سائنس کی ایک الگ وزارت قائم کی جائے لیکن اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا گیا۔ اِدھر ۱۹۵۲ء میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔ ان دِنوں ان پر قاتلانہ حملے کی بھی کوشش کی گئی اور وہ باہر جانے پر مجبور ہو گئے اس دَوران انہیں کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے ملازمت پیش کی گئی اور جنوری ۱۹۵۴ء میں وہ کیمبرج پہنچ گئے جہاں سے اُنکی زندگی کا ایک نیا موڑ شروع ہوا۔

شاندار سائنسی کارنامے اور عالمگیر شہرت

عبدالسلام اِسلامی ملکوں کے پہلے مسلمان اور ہندوپاک کے پہلے سائنسدان ہیں جنہیں سب سے شاندار اور انگلینڈ کی بہت بڑی یونیورسٹی [9] میں لیکچرار کی نوکری کی پیشکش ہوئی۔ [10]

کیمبرج میں ڈاکٹر سلام گریجویٹ اور پی ایچ ڈی کی کلاسوں کو پڑھانے اور اُن کی نگرانی پر مقرر ہوئے۔ کیمبرج میں ایک ہی مضمون آدھی آدھی کلاس کو دو پروفیسر پڑھاتے تھے اور طلباء کو یہ سہولت تھی کہ دونوں میں سے جس پروفیسر کی کلاس میں جانا چاہیں جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سلام بجلی اور مقناطیس کا مضمون پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز اتنا دلچسپ تھا کہ دو تہائی طلباء ڈاکٹر سلام کی کلاس میں جاتے اور صرف ایک تہائی طلباء دوسرے پروفیسر کا لیکچر سُنتے۔

کیمبرج میں ڈاکٹر سلام نے تحقیق کا کام جاری رکھا۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ۱۹۵۵ء میں پانچ اور ۱۹۵۶ء میں چار مقالے لکھے۔ ان تحقیقی کاموں کی وجہ سے وہ چند سالوں میں ہی مشہور سائنسدان بن گئے اور انہیں دُنیا کی بڑی بڑی سائنسی کانفرنسوں میں شامل کیا جانے لگا چنانچہ ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر سلام کو اقوامِ متحدہ نے ایٹم برائے امن کی پہلی کانفرنس کے لئے سیکرٹری چُنا۔ یہ کانفرنس سوئٹزرلینڈ میں جنیوا کے مقام پر ہوئی جہاں انہیں سائنس کے ذریعے خدمت کا بہت احساس ہوا۔

۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر سلام امپیریل کالج لندن میں پروفیسر بنا دیئے گئے اس وقت ان کی عمر صرف اکتیس [11] سال کی تھی۔ اِس سے پہلے انگریزوں میں اِتنا بڑا عہدہ کسی مسلمان کو نہیں ملا تھا۔

امپیریل کالج میں آنے کے بعد انہوں نے ایٹم کے بُنیادی ذرات پر لیکچر دیا جس میں دُنیا کے چوٹی کے سائنسدان شریک ہوئے اور ان کی شہرت دُنیا میں بڑھنے لگی۔ ان دنوں پاکستان کے ایک مشہور سیاستدان اور پاکستان کی انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے مالک میاں افتخار الدین اِنگلستان گئے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایک پاکستانی لندن یونیورسٹی میں سائنس کا چیئرمین ہو سکتا ہے انہوں نے پاکستان ٹائمز کے پورے صفحے پر ڈاکٹر سلام پر ایک شاندار مضمون دیا جس سے پاکستانیوں کے سر فخر سے بلند ہونے لگے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے ملک سے باہر ریاضی اور طبیعات میں تحقیقی کام کرنے کا بہت موقع ملا اور ان کی اللہ تعالیٰ ہمیشہ مدد اور رہنمائی کرتا رہا انہوں نے ان علوم میں نئی نئی باتیں پیش کیں اور مختلف ملکوں کے بُلانے پر وہ ملک ملک جا کر اپنے نظریات کی وضاحت کرتے رہے۔ اُنہوں نے سخت محنت کو ہمیشہ اپنی کامیابی کا ذریعہ بنایا اِتنی زیادہ محنت کرنے کے باوجود وہ لوگوں کے ساتھ خوشی کے ساتھ ملتے۔ قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم جو گورنمنٹ کالج لاہور اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے پرنسپل رہ چکے ہیں، کا بیان ہے کہ سلام ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان اٹھارہ ماہ تک اُن کے پاس لاہور میں رہے ان کو سخت محنت کی عادت تھی جب بھی کوئی اُن کے کمرے میں گیا اُس نے دیکھا کہ سلام کُرسی میز پر بیٹھے کام کر رہے ہیں لیکن اُس کے ساتھ خوش ہو کر ملتے اور اسے پورا وقت دیتے حتّٰی کہ وہ چلا جاتا اور ڈاکٹر سلام پھر اپنے کام میں لگ جاتے اور انہیں کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ اُن کے کام میں حرج واقع ہُوا ہے۔ یہی کیفیت اُن کی اِنگلستان میں رہی۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے بہت شروع میں ایٹم کے بُنیادی ذرات پر تحقیق کا کام شروع کیا اور جن جن نئے نظریات کی نشاندہی کی ان پر تحقیق کر کے کئی سائنسدان مدّتوں بعد اسی نتیجہ پر پہنچے۔

۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر سلام نے ایٹم کے بُنیادی ذرات کے بارہ میں جو نظریہ پیش کیا اس کی دُنیا کے بڑے بڑے سائنسدانوں نے بہت مخالفت کی اور جب دوسرے سائنسدانوں کے تجربوں سے سلام کا نظریہ درست نکلا تو ان کی شہرت میں بہت اضافہ ہُوا اور ۳۳ سال کی عمر میں اِنگلستان کی شاہی سوسائٹی نے انہیں اپنا فیلو بنا لیا۔ یہ اِعزاز اس سے پہلے کِسی مسلمان کو نہیں مل سکا۔

جو نئے نظریات ڈاکٹر سلام پیش کر رہے تھے اُنکی تصدیق اِس طرح سے ہو جاتی کہ امریکہ اور جاپان اور چین وغیرہ کے سائنسدان اپنی تحقیق کے ذریعے اسی نتیجہ پر پہنچ جاتے۔ جلد ہی ڈاکٹر سلام ساری دُنیا کے سائنسدانوں میں مشہور ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان کے کاموں کی قدر کرتے ہوئے ۱۹۵۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے انہیں ہاپکن اِنعام اور ۱۹۵۸ء میں آدم اِنعام دیا ۱۹۶۱ء میں انہیں انگلستان میں سائنس کی سب سے بڑی سوسائٹی نے میڈل [12] اور ایک سو گنی انعام دیا۔ ۱۹۵۹ء میں حکومتِ پاکستان نے انہیں ستارۂ پاکستان، پرائڈ آف پرفارمنس اور بیس ہزار روپے کا اِنعام دیا۔ ۱۹۶۴ء میں سلام کو دُنیا کی سائنس کی سب سے پُرانی سوسائٹی نے میڈل [13] دیا اِس موقع پر ایک رسالے نے لکھا کہ

"دُنیا میں ایسے بہت کم سائنسدان ہیں جنہوں نے مسلسل اور اتنی تیزی سے نئے نظریات پیش کئے ہوں جیسے ڈاکٹر عبدالسلام نے گذشتہ تیرہ سالوں میں کئے ہیں۔" [14]

۱۹۶۹ء میں انہیں امریکہ کی یونیورسٹی آف میامی نے ان کی خدمات پر اوپن ہیمر میڈل دیا۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں سویڈن نے ۱۹۷۱ء میں رُوس نے اور امریکہ نے ڈاکٹر سلام کو اپنی اپنی سوسائٹی

---

[5] ماخوذ از انگلش کتاب عبدالسلام مؤلفہ ڈاکٹر عبدالغنی۔

[6] Tripos

[9] کیمبرج یونیورسٹی۔ [10] تاہم ہندوستان کے راوھا کرشنا آکسفورڈ میں فلاسفی کا مضمون پڑھا چکے ہیں لیکن فلاسفی غیر سائنسی مضمون تھا سائنس کا مضمون سب سے پہلے پڑھانے کا اعزاز صرف ڈاکٹر سلام کو حاصل ہوا۔ راوھا کرشنا ہندوستان کے دوسرے صدر بنے

[11] Biographic Sketch of Prof. Abdus Salam by Dr. A. Ghani.

[7] ڈاکٹر بھابا [8] ڈاکٹر پالی

[12] Maxwell Medal کی طرف سے Physical Society

[13] Hugeus Medal // Royal Society England.

[14] Biographic Sketch of Prof. A. Salam

کا رکن بنا لیا[1]

ڈاکٹر عبدالسلام ابھی بچہ تھے کہ ان کے والد صاحب کو خواب کے ذریعے ان کے تیزی کے ساتھ ترقی کرنے کے بارہ میں اطلاع دی گئی۔ ان کے والد صاحب فرماتے ہیں:۔

"ایک رؤیا میں ایک نہایت بلند درخت دکھایا گیا جسکی شاخیں فضا میں نہایت ارفع چلی گئی ہیں عزیزم عبدالسلام اس درخت پر چڑھ رہا ہے اور بڑی پھرتی سے چڑھتا چلا جا رہا ہے ..... دیکھ کر میں ڈرا کر معصوم بچہ ہے گر نہ جائے اور اسے زور سے آواز دینے لگا کہ سلام اب بس کرو اور نیچے اُترو۔ بچہ میری طرف دیکھتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے کہ ابا جان فکر نہ کریں۔ یہ کہتے ہوئے پھر اُوپر ہی اُوپر چڑھتا گیا اور اتنی بلندی پر گیا کہ گویا نظروں سے اوجھل ہو گیا"[2]

۱۹٦۴ء میں ڈاکٹر عبدالسلام نے اٹلی میں انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے تحت اٹلی کی مدد سے سائنس کا عالمی مرکز قائم کیا۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس پر انہیں ۱۹٦۸ء میں اقوامِ متحدہ نے "ایٹم برائے امن" کا عالمی ایوارڈ اور تیس ہزار ڈالر انعام دیا نیز ۱۹۷۰ء سے اقوامِ متحدہ کا ادارہ یونیسکو بھی فریق بن گیا۔ ۱۹٦۸ء میں انہوں نے ساری دُنیا کے لئے ایک سائنسی[3] ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی جس کو بہت اچھا سمجھا گیا اور امریکہ نے انہیں میڈل[4] دیا۔ اپنی تحقیق کے نتیجہ میں ڈاکٹر سلام نے چار میں سے دو بنیادی طاقتوں کو یکجا کرنے کا نظریہ پیش کیا[5] جس پر لندن کے طبیعات کے ادارے نے انہیں ۱۹۷٦ء میں میڈل[6] دیا اور ہندوستان کی کلکتہ یونیورسٹی نے انہیں ۱۹۷۷ء میں میڈل دیا اور ۱۹۷۸ء میں رائل سوسائٹی نے اعلیٰ ترین شاہی میڈل دیا۔

نوبیل اِنعام کا حصول

اب تک۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو دُنیا کے بہترین اِنعام مل چکے تھے لیکن سب سے بڑا اِنعام یعنی "نوبیل پرائز" ابھی نہیں ملا تھا اُن کی خواہش تھی کہ یہ اِنعام بھی ان کو مل جائے کیونکہ اس اِنعام کا حاصل کرنا اِسلام اور پاکستان کے لئے باعثِ عزت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے تیسرے خلیفہ حضرت حافظ مرزا ناصر احمدؒ ۱۹۷۸ء میں کسرِ صلیب کانفرنس کے لئے جب یورپ تشریف لے گئے تو ڈاکٹر سلام نے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا اور حضرت صاحب کو دُعا کے لئے عرض کی۔ آپؒ نے دُعا کی اور آپ کو خدا کی طرف سے بتایا گیا کہ سلام نے اب تک جو تحقیق کی ہے اس پر تو نوبیل انعام مشکل ہے البتہ اگلے سال تک جو کام وہ کریں گے اس پر انہیں نوبیل انعام مل سکے گا[7]

چنانچہ اگلے سال ۱۹۷۹ء میں پروفیسر عبدالسلام صاحب کو دو امریکی سائنسدانوں کے ساتھ فزکس کے بہترین کام پر نوبیل اِنعام مل گیا[8] اور یہ ڈاکٹر سلام کی محنت۔ اور امام جماعتِ احمدیہ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

نوبیل اِنعام ایک سویڈش سائنسدان مسٹر الفرڈ بن ہارڈ نوبیل کی یاد میں دیا جاتا ہے۔ نوبیل ۲۱ اکتوبر ۱۸۳۳ء میں سٹاک ہوم کے مقام پر جو کہ سویڈن کا دارالحکومت ہے پیدا ہوا اور ۱۰ دسمبر ۱۸۹٦ء کو اٹلی میں فوت ہوا۔ نوبیل ایک بہت بڑا کیمیادان اور انجنیئر تھا اس کی وصیت کے مطابق ایک فاؤنڈیشن بنائی گئی جس کا نام نوبیل فاؤنڈیشن رکھا گیا۔ یہ فاؤنڈیشن ہر سال ۵ اِنعامات دیتی ہے۔ ان اِنعامات کی تقسیم کا آغاز دسمبر ۱۹۰۱ء میں ہوا جو کہ الفرڈ نوبیل کی پانچویں برسی تھی۔

نوبیل اِنعام فزکس، فزیالوجی، کیمسٹری یا میڈیسن، ادب اور امن کے شعبوں اور میدانوں میں نمایاں اور امتیازی کارنامہ سرانجام دینے والے کو دیا جاتا ہے۔ ہر انعام ایک طلائی تمغہ اور سرٹیفکیٹ اور رقم بطور انعام جو کہ تقریباً ۸۰ ہزار پونڈ پر مشتمل ہوتی ہے دی جاتی ہے۔ نوبیل اِنعام حاصل کرنے والے امیدواروں کے نام مختلف ایجنسیوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اور وہ اِنعام کے صحیح حقدار کا فیصلہ کرتی ہیں۔ مثلاً فزکس اور کیمسٹری رائل اکیڈمی آف سائنس سٹاک ہوم

[1] Royal Academy of Sciences Sweden, Academy of Sciences USSR, American Academy of Arts and Sciences

[2] سرگزشت

[3] Biographic Sketch of Prof. Abdus Salam by Dr. A. Ghani.

[4] International Federation of Institution of Advance Studies.

[5] John Torence Tate Medal From Amerial Institute of Physics.

[6] Unified Electroweak Theory

[7] Gother Medal

[8] اِس امر کا ذکر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے نومبر ۱۹۸۰ء کے آخری ہفتہ میں اِسلام آباد اپنے قیام کے دوران ایک روز بعد نماز مغرب وعشاء مجلس عرفان میں فرمایا۔ خاکسار اس میں خود موجود تھا۔

[9] مشرق ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء نے خبر دی۔ "سٹاک ہوم ۱۵ اکتوبر (رائٹر) پاکستان کے ممتاز اور نامور سائنسدان پروفیسر عبدالسلام کو طبیعات میں نمایاں تحقیقی کام کرنے پر ۱۹۷۹ء کا نوبیل اِنعام دیا گیا۔ پروفیسر عبدالسلام پاکستان کے بلکہ تمام ترقی پذیر ممالک اور عالمِ اسلام کے پہلے مسلمان سائنسدان ہیں جنہیں اِس عالمی اِعزاز کا مستحق سمجھا گیا۔"

کے سپرد ہوتی ہے۔ فزیالوجی یا میڈیسن کیرولین میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سٹاک ہوم کے سپرد ہوتی ہے۔ اُدب کا مضمون سویڈش اکیڈمی آف فرانس اور سپین کے سپرد اور امن کا اِنعام ایک کمیٹی کے سپرد ہوتا ہے جس کے پانچ ممبر ہوتے ہیں جو کہ نارویجین پارلیمنٹ چنتی ہے[1]

۱۵ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو ڈاکٹر سلام نے نوبیل اِنعام کا حقدار قرار دیئے جانے کی خبر سُنی تو وہ مسجد احمدیہ لندن جا کر خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ ریز ہو گئے۔

انہوں نے نوبیل اِنعام ۱۰ دسمبر ۱۹۷۹ء کو سٹاک ہوم میں شاہ سویڈن کارل گستاف سے حاصل کیا جہاں وہ بادشاہ اور ملکہ کے دس دنوں تک مہمان رہے۔ نوبیل اِنعام کی خاص تقریب کے بعد رات کو انہیں سویڈن کے بادشاہ اور ملکہ کے ساتھ کھانا پیش کیا گیا جس میں اَٹھائی ہزار مہمان شامل ہوتے ہیں۔ کھانے کے بعد ہر مضمون میں اِنعام حاصل کرنے والوں کی طرف سے ایک ایک نمائندہ تین تین منٹ کی تقریر کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلام نے فزکس میں اِنعام حاصل کرنے والوں کی طرف سے تین منٹ کی ایک شاندار تقریر کی اور اس کی بُنیاد قرآن کریم کی سورۃ الملک کی آیات ۴، ۵ پر رکھی[2]

ڈاکٹر عبدالسلام کے نوبیل اِنعام حاصل کرنے پر پُورے عالمِ اسلام، پاکستان اور تیسری دُنیا میں خاص طور پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے انہیں مبارکباد کا تار دیا جس میں فرمایا:

"سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میری طرف سے اور جماعتِ احمدیہ کی طرف سے پُرخلوص دِلی مبارکباد قبول کریں۔ احمدیت اور تمام پاکستانیوں کو آپ پر فخر ہے کہ وہ پہلا مسلمان سائنسدان اور پاکستانی جس کو اِنعام ملا وہ ایک احمدی ہے۔ خدا تعالیٰ مستقبل میں آپ کو اپنی تائید و نصرت سے نوازتا رہے۔"

(بحوالہ الفضل ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

اِسلام کے دائمی مرکز مکہ کے ایک اخبار نے لکھا:۔

"ایک مسلمان پاکستانی عالم کا اس انعام کا حصول سارے عالمِ اسلامی کے لئے شرف و عزت کا موجب اور ان کی محنت کا ثمرہ ہے"[3]

صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی مبارکبادی کا تار دیا اور کہا کہ "آپ نے یقیناً پاکستان کی عظمت اور سرفرازی کو نئی تابانی بخشی ہے"[4] اور انہیں اعلیٰ ترین سول اعزاز "نشانِ امتیاز" دیا۔ اِسلام آباد اور ملتان یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

اِسلام آباد یونیورسٹی کے سربراہ نے کہا:

"سالہا سال کی تحقیق کے بعد ماہرینِ طبیعات نے قدرت کی چار بنیادی قوتیں تلاش کر لیں (۱) کشش ثقل (۲) برقی مقناطیسی قوت (۳) کمزور جوہری قوت (۴) طاقتور جوہری قوت۔

ماہرینِ طبیعات یہ چاہتے ہیں ..... کہ چار بظاہر مختلف قوتوں کو ایک متحد قوت کا رُوپ دیا جائے۔ آئن سٹائن نے بھرپور کوشش کی کہ وہ کشش ثقل کو بجلی کی قوت سے متحد کر سکے۔ عبدالسلام، شیلڈن گلاشو اور سٹیون وینبرگ تمام لوگوں نے علیحدہ علیحدہ کام کر کے ..... کمزور جوہری قوت اور برقی مقناطیسی قوت کو متحد کر دیا ہے ..... یہ ایک انتہائی اہمیت کا حامل نظریہ ہے جو کہ انیسویں صدی میں فیراڈے اور میکسویل کے بجلی اور مقناطیسیت کو ہم آہنگ کرنے کے تاریخی واقعہ کے برابر ہے"[5]

ڈاکٹر عبدالسلام کی نوبیل اِنعام ملنے پر دُنیا بھر میں عزت افزائی ہوئی۔ اٹلی کے وزیرِاعظم نے ۸ نومبر ۱۹۷۹ء کو انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ ۱۵ جنوری سے ۲۹ جنوری تک وہ تیسری دُنیا کے ترقی پذیر لاطینی ممالک کے دورے پر رہے جہاں انہیں کئی یونیورسٹیوں کی طرف سے اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔ وینزویلا کے صدر نے اعلیٰ ترین سول اعزاز دیا۔ مراکش کے شاہ حسن نے اپنی اکیڈمی کا رُکن بنایا۔ پیرس نے آئن سٹائن گولڈ میڈل دیا اور روم، پیرس، یوگوسلاویہ، ہندوستان اور کئی اور ملکوں نے انہیں رُکن بنایا۔

شاندار کامیابیوں کا راز

ڈاکٹر عبدالسلام کی کامیابیوں کا ایک راز ہے جس کا ذکر انہوں نے جلسہ سالانہ ۱۹۷۹ء کے موقع پر اپنی مختصر تقریر میں یُوں کیا۔

"آج سے تقریباً پندرہ سال پیشتر حضرت والد صاحب چوہدری محمد حسین مرحوم ..... نے اپنی ڈائری میں مندرجہ ذیل سطور رقم فرمائی تھیں:۔

حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔اے مرحوم نے بندہ کو بمقام لندن ایک خط لکھا جس میں درج

[1] بحوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا

[2] بحوالہ ماہنامہ انصار اللہ جنوری، فروری ۱۹۸۰ء

[3] العالم الاسلامی ۱۹ نومبر ۱۹۷۹ء

[4] بحوالہ جنگ کراچی ۱٦ اکتوبر ۱۹۷۹ء

[5] سپاسنامہ از وائس چانسلر قائدِاعظم یونیورسٹی اِسلام آباد۔ بحوالہ ماہنامہ انصار اللہ جنوری، فروری ۱۹۸۰ء

تھا کہ میں آپ کے عزیز فرزند کے متعلق دور اُفق میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کو پُورا ہوتے دیکھتا ہوں۔

الفاظ پیشگوئی ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

"میرے فرقہ کے لوگ اِس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رُو سے سب کا مُنہ بند کر دیں گے۔ ....سو اے سُننے والو! اِن باتوں کو یاد رکھو اور ان پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں محفوظ رکھ لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دِن پُورا ہوگا"

(تجلیاتِ الٰہیہ صفحہ ۱۸، ۱۷)

میں اُس پاک ذات کی حمد و ستائش سے لبریز ہوں کہ اُس نے امامِ وقت کی، میرے والدین کی اور جماعت کے دوستوں کی مسلسل اور متواتر دُعاؤں کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور عالمِ اِسلام اور پاکستان کے لئے خوشی کا سامان پیدا کیا۔

ڈاکٹر سلام نے اپنی زندگی کو صحیح اِسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال کر اپنے آپ کو امامِ وقت، والدین، بزرگوں، استادوں، عزیزوں اور دُکھی اِنسانوں کی دُعاؤں کا مستحق بنایا اور خدا تعالیٰ نے ان کے بابرکت وجود کے ذریعے حضرت مسیح موعودؑ کی پیشگوئی پوری فرمائی۔ انہوں نے دین کو دُنیا پر ہمیشہ مقدم رکھا اور سائنسدانوں اور بڑے بڑے لوگوں تک احمدیت کا پیغام پہنچایا۔ شاہِ سویڈن کو نوبیل انعام حاصل کرنے کے دنوں میں قرآن کریم اور حضرت مسیح موعودؑ کے اقتباسات کا انگریزی ترجمہ پہنچا کر آئے۔ اِسی طرح شاہ حسن کو مراکش میں لٹریچر دے کر آئے۔ ان کے بہنوئی عبدالشکور صاحب کا بیان ہے کہ وہ جہاں جاتے ہیں اپنی خیریت کا خط پاکستان لکھتے رہتے ہیں اور واپسی پر ہمیشہ لکھتے ہیں پیغامِ حق پہنچانے کی بھی توفیق ملی، الحمدللہ۔

دراصل اُن کی کامیابیوں کا راز یہی ہے کہ وہ دین کی خدمت کرنے والے اور اللہ کے بندوں کے بہت ہمدرد ہیں۔ ماں باپ کی بے انتہاء خدمت کی انہیں توفیق ملی اور انہوں نے ماں باپ کی بہت دعائیں لیں۔ اُن کی ایک بہن کہتی ہیں:۔

"..... ابا جان اور محترمہ والدہ صاحبہ سے بہت ادب اور احترام کے ساتھ بات کرتے تھے۔ یہ عادت اُن کی شروع دِن سے تھی کہ ہر بات اور ہر کام میں اُن کے مشورے پر چلنا..... ابا جان کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تھا تو ہمیشہ ابا جان کو اپنے سے پہلے رکھا۔ لوگ دیکھ کر رشک کرتے تھے ..... والدہ صاحبہ مرحومہ بتایا کرتی تھیں کہ جب بھائی جان انہیں لندن کے سفر پر لے جاتے اور لے آتے تھے تو راستہ میں اُن کے ساتھ ایسا حال ہوتا تھا جیسا کہ ایک ماں اپنے معصوم بچے سے کرتی ہے ہر لحہ اُن کے آرام کا دھیان۔ ایئرہوسٹس بیٹے کے اِس سلوک پر اماں جی کو کہا کرتی تھیں آپ نے اپنے بیٹے کو کیسے پالا تھا۔ اماں جی مُسکرا کر اللہ تعالیٰ کا شُکر ادا کرتی تھیں"[2]

جناب بشیر احمد رفیق مبلغِ انگلستان لکھتے ہیں:۔

"جب کبھی آپ نے کسی کو مدعو کیا خواہ وہ دُنیوی لحاظ سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ان کے والد ضرور اس میں شامل ہوتے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ڈیوک آف ایڈنبرا اور شاہی افراد سے ملاقات تھی تو اپنے والد محترم کو بھی ساتھ لے گئے"[3]

ڈاکٹر عبدالسلام اپنی تحقیق کی بُنیاد ہمیشہ قرآن کریم پر رکھتے ہیں اور احادیثِ نبویؐ اور کتب حضرت مسیح موعودؑ سے مدد لیتے ہیں۔ ہمیشہ دُعاؤں سے کام لیتے ہیں۔ بہت بڑھ چڑھ کر مالی قربانی اور غریبوں کی امداد کرتے ہیں۔ اِتنی عزت کے باوجود بہت سادہ اِنسان ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ایک مرتبہ فرمایا:۔

"ڈاکٹر سلام کی عزت اور مرتبہ کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی کانفرنس ہو رہی ہو اور اس میں رُوس، امریکہ اور دیگر ممالک کے چوٹی کے سائنسدان شریک ہوں اور یہ بعد میں کانفرنس ہال میں داخل ہوں تو جونہی یہ داخل ہوتے ہیں سارے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اُن کی اپنی یہ حالت ہے کہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کسی کی پروا نہیں کوئی خیال نہیں کہ میں اِتنا بڑا اِنسان ہوں۔ نہ آرام کا خیال نہ کپڑوں کا خیال۔ آپ اُن سے ملیں تو عام اِنسانوں جیسا..... سمجھیں ..... وہ بالکل نہیں جانتے کہ میں اِتنا بڑا سائنسدان ہوں اور دوسروں میں اور مجھ میں کوئی فرق ہے"[4]

ڈاکٹر عبدالسلام کی یہ عادت ہے کہ ہر کام میں خلیفۂ وقت سے مشورہ لیتے ہیں اور مسلسل دعاؤں کے لئے لکھتے رہتے ہیں۔ خلفائے سِلسلہ بھی اُن سے خصوصی شفقت کا سلوک فرماتے رہے ہیں۔ ابھی نوبیل اِنعام ملنے کے بعد ۱۹۷۹ء کے جلسہ سالانہ پر حضرت خلیفۃ المسیح

[1] بحوالہ الفضل ۱۳ دسمبر ۱۹۷۹ء

[2] خط بنام خاکسار۔ محمود مجیب اصغر ۱۷ مارچ ۱۹۸۲ء

[3] اِقتباس از مضمون اِس صدی کا عظیم مسلمان سائنسدان بحوالہ خالد نومبر دسمبر ۱۹۷۹ء

[4] خطاب سالانہ اجتماع لجنہ اماء اللہ مرکزیہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء

نے تعلیمی منصوبہ کے سِلسلہ میں ذہین بچوں کو ہر سال سوا لاکھ روپے کے وظائف کے لئے جو کمیٹی بنائی عزت افزائی کے طور پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو اس کمیٹی کا صدر بنا دیا[1]

میں سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اِس اِعزاز کو اپنے تمام عالمی اعزازات سے بھی زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔

ڈاکٹر سلام کی کامیابیوں کا ایک راز یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو خدا تعالیٰ کا قول اور سائنس کو خدا تعالیٰ کا فعل سمجھتے ہیں اور سائنس پر تحقیق کو عبادت سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اپنی تقریروں میں قرآن کریم کے اُن حکموں کو پیش کرتے ہیں جن میں سائنسی علوم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح نتائج پر اِتنا جلدی پہنچ جاتے ہیں جن تک پہنچنے کے لئے باقی سائنسدان کئی کئی سال لیتے ہیں۔

پاکستان، اِسلامی دُنیا اور تیسری دُنیا کیلئے خدمات

وطن سے بے پناہ محبت ہمارے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ

حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ

اپنے وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے

اِس کے مطابق ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے مُلک پاکستان کے ساتھ زبردست محبت اور یہاں سائنس کی ترقی سے جذباتی تعلق تھا۔ اِنگلستان کئی سالوں سے رہنے کے باوجود بھی انہوں نے وہاں کی قومیت نہیں لی اور ہمیشہ پاکستانی ہونے میں فخر محسوس کیا یہی وجہ ہے کہ جب شاہِ سویڈن سے نوبیل اِنعام وصول کرنے گئے جہاں سب مغربی لباس پہن کر گئے تھے وہ پاکستانی لباس پہن کر گئے۔

حکومتِ پاکستان کے سائنسی مشیرِ اعلیٰ ۱۹٦۱ء میں صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خاں کی پیشکش پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بغیر تنخواہ حکومت کا سائنسی مشیر بننا منظور کر لیا اور مندرجہ ذیل اہم خدمات سرانجام دیں:۔

- مُلک سے غربت ختم کرنے کے لئے سائنس کی ترقی کیلئے کوشش۔
- ایٹمی سائنس کی تجربہ گاہوں کا اِسلام آباد میں قیام[2]
- پاکستان میں فزکس کا عالمی مرکز بنانے کا منصوبہ جو اٹلی کی امداد سے اٹلی میں بنا۔
- سوات سائنس کانفرنس کا اِنعقاد۔
- سیم اور تھور ختم کرنے کے لئے ٹیوب ویل لگانے کا مربُوط منصوبہ۔
- پاکستان کی سائنسی منصوبہ بندی۔

۱۹٦۸ء میں جنرل محمد یحییٰ خاں پاکستان کے صدر بنے اور ۱۹۷۱ء تک صدر رہے اس عرصہ میں بھی سلام حکومت کے سائنسی مشیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس عرصہ میں اُن کی اہم خدمات مندرجہ ذیل ہیں:۔

- سائنسی تحقیق اور ترقیاتی منصوبہ بندی کے لئے حکومت کو اہم مشورے۔
- پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کا قیام۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے حکومت سنبھالی اور ڈاکٹر سلام بدستور حکومت کے سائنسی مشیر کے طور پر مفت کام کرتے رہے اِس دوران انہوں نے مندرجہ ذیل کام کئے:۔

- مسلمان ملکوں میں سائنس کی ترقی کے لئے اِسلامک سائنس فاؤنڈیشن بنانے کی تجویز۔
- حکومت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی الگ وزارت کا قیام۔

آپ کی مزید چند خدمات یہ ہیں:۔

- ۱۹۷٦ء میں نتھیا گلی مری میں عالمی سیمینار کا اِنعقاد۔
- اپنے ذاتی اِنعامات میں سے پاکستانی طالب علموں کو وظیفے۔
- عالمی اداروں سے پاکستان کے مختلف کالجوں میں سائنسی آلات کی فراہمی۔
- سائنس کی ترقی کے لئے ایک فیصد سالانہ بجٹ خرچ کرنے کا مشورہ۔

اِسلامی دُنیا کے لئے خدمات ڈاکٹر سلام کی سائنسی خدمات کی بدولت سات سَو سال بعد ایک مسلمان سائنسدان کا ذکر سائنس کی کتابوں میں آیا ہے اور ڈاکٹر سلام کی تھیوریاں یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں جو بذاتِ خود اِسلامی دُنیا کی زبردست خدمت ہے۔ بعض اور خدمات یہ ہیں:۔

- اِسلامی ممالک میں سائنسی علوم کی ترقی کے لئے حکومتوں کو مشورے۔
- اِسلامک سائنس فاؤنڈیشن کا قیام۔
- اقوامِ متحدہ کی سائنس کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے اِسلامی ممالک کی خدمات۔
- اِسلامی ممالک کے دورے اور مفید مشورے۔
- تیل پیدا کرنے والے ممالک کو عالمی سطح پر سائنس کا ایک مرکز بنانے کی تجویز اور اس کام کے لئے اپنا سارا نوبیل انعام ساٹھ ہزار ڈالر دینے کا اِعلان۔

باقی صفحہ ۱۰ پر

[1] بحوالہ الفضل ۳ جنوری ۱۹۸۰ء

[2] Pakistan Institute of Nuclear Science and Technology (Pinstech)

قرآن ۔ اور ۔ سائنس

ڈاکٹر عبدالسلام مرحوم کا ایک فکر انگیز تحقیقی مضمون

(باب اوّل)

قرآن کریم اور سائنس

ابتدا اس اقرار سے کرتا ہوں کہ میرا عقیدہ اور عمل اسلام پر ہے اور میں اس وجہ سے مسلمان ہوں کہ قرآن کریم پر میرا ایمان ہے۔ قرآن کریم میں بحیثیت ایک سائنس داں کے مجھ پر فرض کیا گیا ہے کہ میں فطرت کے قوانین کو سمجھنے کی کوشش کروں اور ان کی تلاش طبیعات، حیاتیات، طب اور ہیئت کے مشاہدات میں کروں کہ ان میں سب کے لئے نشانیاں ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝

تو کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں۔ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔

اور پھر ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات کے اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لئے۔

قرآن شریف کی ساڑھے سات سو آیتوں میں یعنی اس پاک کتاب کے تقریباً آٹھویں حصہ میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ایمان لانے والے فطرت کا مشاہدہ کریں، اس پر غور کریں اور اس کے بھید کھولنے کے لئے کوشاں رہیں کہ انہیں عقل اسی لئے دی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ وہ تحصیل علم کو اپنی روزمرّہ زندگی کا حصہ بنائیں۔ درود و سلام ہمارے پیارے نبی پر کہ انھوں نے تعلیم کو ہر مرد و عورت کے لئے ضروری بتایا۔

یہ گویا بنیاد ہے علم و حکمت کی طرف اسلامی تصورات کی۔ اس کے ساتھ دوسری اہم بات یہ ہے جس کی طرف مارِس بوکائی نے اپنے مقالہ "بائبل، قرآن اور سائنس" میں اشارہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ قرآن کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جس میں فطرت کے مظاہر کی ایسی توجیہہ کی گئی ہے جن سے ہماری سائنسی تحقیقات کی نفی لازم آئے۔

تیسری بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ پوری اسلامی تاریخ میں گیلیلو والے قصہ کی طرح کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ سائنسی نظریات کے لئے نہ تو کسی کو سزا دی گئی اور نہ کسی پر کفر کے فتوے لگے۔ حالانکہ بدقسمتی سے آج بھی مذہبی معاملات میں شدّت جاری ہے۔ اور ان معاملات کے لئے کفر کے فتوے بھی دیئے جاتے رہے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ نظریاتی احتساب کا معاملہ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے کٹر مذہبی لوگوں نے نہیں اٹھایا بلکہ معتزلہ نے پہل کی جو اپنے آپ کو روشن خیال اور آزادیٔ فکر کا علمبردار سمجھتے تھے۔ اس جگہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ معتزلہ بھی درحقیقت مذہبی عالم تھے۔ اور ان کے احتساب اور ان کی مذہبی عصبیت کا شکار احمد بن حنبلؒ جیسے پایہ کے بزرگ عالم دین رہے تھے۔

۲۔ موجودہ سائنس ۔ یونانی ۔ عرب میراث

سوال یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات اور اپنے پاک نبیؐ کے ان ارشادات کی طرف کیا رویہ اختیار کیا؟

اپنے پاک نبیؐ کے وصال کو ابھی سو برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ انھوں نے اس زمانہ تک کے سارے علوم پر عبور حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام سے ایک سلسلہ جاری ہوا جس سے ان کو ایسی علمی برتری حاصل ہوئی جو آئندہ ساڑھے تین سو سال تک باقی رہی۔

اسلامی دنیا میں سائنس کا جو مرتبہ تھا اس کا کچھ اندازہ اس سرپرستی سے لگایا جا سکتا ہے جو سائنس کو مسلمانوں کی دولت مشترکہ میں نصیب تھی۔ یہاں ہم کسی قدر ترمیم کے ساتھ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کے وہ اقوال نقل کرتے ہیں جو ادب کے متعلق کہے گئے تھے:

"دوسری مملکتوں کے مقابلے میں دنیائے اسلام میں سائنس کی ترقی کا انحصار بہت حد تک اس سرپرستی پر تھا جو اسے حاصل رہی۔ جب تک دارالحکومتوں میں وزیر اور شہزادے سائنس کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے علم کی شمع بھی روشن رہی۔ یہ سبقت کبھی ذاتی فائدے کبھی محض اپنی خوشی اور کبھی حصول عزت کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔"

بلاشبہ اسلامی دنیا میں سائنس کی ترقی کا نقطۂ عروج ۱۰۰۰ء کے آس پاس تھا۔ یہ زمانہ ابن سینا کا تھا جو قرونِ وسطیٰ کے آخری عالم تھے۔ البیرونی اور ابن الہیثم ان کے نامور ہم عصر دورِ جدید کے نقیب تھے۔

ابن الہیثم (جنہیں یورپ والے الہیزن کہتے ہیں) (۹۶۵ء — ۱۰۲۹ء) کا شمار دنیا کے جید ترین علمائے طبیعیات میں ہوتا ہے۔ علم البصر یعنی آپٹکس میں ان کے تجربات اعلیٰ ترین معیار کے تھے اور ان سے علم میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ ان کا مشاہدہ تھا کہ "روشنی کی کرن جب کسی واسطہ یا فضا سے گذرتی ہے تو ایسا راستہ اختیار کرتی ہے جو سب سے آسان اور سب سے جلد طے ہو سکتا ہو"۔ ابن الہیثم کے اس مشاہدہ کو سینکڑوں برس بعد فرما نے نور کے سفر کے کم سے کم وقت والے اصول کے نام سے پیش کیا۔ یہ ابن الہیثم ہی تھا جس نے سب سے پہلے مادہ کے جمود کا تصور دیا جو کافی بعد میں نیوٹن کے حرکت کے پہلے قانون کے نام سے مشہور ہوا۔ راجر بیکن کی تصنیف "اوپس میجیئس" کا پانچواں جزو تو گویا ابن الہیثم کے علم البصر کی نقل ہے۔

البیرونی (۹۷۳ء — ۱۰۴۸ء) ابن سینا کے دوسرے نامور ہم عصر نے آج کل کے افغانستان میں کام کیا۔ ابن الہیثم کی طرح ان کے علم کی بنیاد بھی ذاتی [illegible] دور جتنا چھ سو سال بعد پیدا ہونے والا گلیلیو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی سائنس یونان۔ عرب میراث ہے۔ لیکن عام طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلامی سائنس کی بنیاد روایتوں سے نتائج نکالنے پر ہے اور یہ کہ مسلمان سائنس دانوں نے آنکھ بند کر کے یونانی علمی روایتوں کی تقلید کی ہے اور سائنس کے تجرباتی میدان میں انھوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

یہ سراسر غلط بیانی ہے۔ ذرا سنئے کہ البیرونی ارسطو کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ "زیادہ تر لوگوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ ارسطو کے خیالات کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ارسطو کے خیالات میں غلطی کا کوئی امکان نہیں حالانکہ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ارسطو نے صرف اپنی بساط بھر ہی نتیجے اخذ کئے ہیں۔"

اور قرونِ وسطیٰ کے توہمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لوگ کہتے ہیں کہ ۱۶ جنوری کو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب زمین کا تمام کھارا پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ پانی کی تمام خصوصیات کا دار و مدار صرف اس زمین کی نوعیت پر ہوتا ہے جہاں یہ پانی پایا جائے اس لئے یہ خصوصیات ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں اور اس لئے مندرجہ بالا بیان غلط ہے اور یہ غلطی ہر اس شخص پر ظاہر ہو جائے گی جو طویل اور مسلسل تجربات کا طریقہ اختیار کرے۔"

اور آخر میں البیرونی کے خیالات علم طبقات الارض کے بارے میں بھی سنئے کہ کس طرح وہ مشاہدہ پر زور دیتے ہیں۔

"اگر آپ ہندوستان کی مٹی دیکھیں اور اس کی نوعیت پر غور کریں، اگر آپ ان گول پتھروں کو دیکھیں جو آپ کو زمین کے اندر ملتے ہیں چاہے جتنی بھی گہرائی میں جائیں۔ ایسے پتھر جو پہاڑوں کے قریب بہت بڑے ہوتے ہیں جہاں دریاؤں کا بہاؤ طوفانی ہوتا ہے اور پہاڑوں سے دوری پر یہ پتھر بہت چھوٹے ملتے ہیں کیونکہ یہاں دریا کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے۔ دریا کے دہانہ کے قریب تو یہ پتھر ریت کی صورت میں ملتے ہیں کہ یہاں تو دریا کا بہنا تقریباً بند ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ان سب باتوں پر غور کریں تو لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ایک زمانہ میں ہندوستان سمندر رہا تھا جو آہستہ آہستہ دریاؤں سے لائی ہوئی ریت سے بھر گیا۔"

بریفالٹ کے الفاظ میں:

"یونانیوں نے تدوین کا کام کیا، عام اصول بنائے اور انھیں علمی زبان میں بیان کیا لیکن طویل اور مسلسل تجربات کا مشکل اور صبر آزما طریقہ اور تجربہ کی کسوٹی پر نتائج اخذ کرنا یونانی فطرت کے خلاف تھا جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب کا سب سے قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔"

ان ہی خیالات کا اظہار سائنس کے مشہور مورخ جارج سارٹن نے اس طرح کیا ہے۔

"قرونِ وسطیٰ کا اصلی لیکن سب سے کم معروف کارنامہ تجرباتی طریقہ کی تخلیق ہے اور یہ دراصل مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا جو بارہویں صدی تک جاری رہیں۔"

تاریخ کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ سائنس کا یہ جدید طریقہ جاری نہ رہ سکا اور اس میں تسلسل ختم ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنسی طریقوں میں کوئی مستقل تبدیلی نہ ہو سکی۔ البیرونی اور ابن الہیثم (IBN-UL-HAITHAM) کو گزرے ابھی سو برس بھی نہ ہوئے تھے کہ دنیائے اسلام میں سائنس کی تخلیق بالکل رک گئی۔ اب پانچ سو برس تک وہ بالغ نظری وہ مشاہدوں پر اصرار اور وہ تجربات کی تکرار دیکھنے اور سننے کو نہیں ملتی یہاں تک کہ ٹائیکو براہے گلیلیو اور ان کے ہم عصروں نے یہ تان دوبارہ اٹھائی۔

۳۔ دنیائے اسلام میں سائنس کا زوال

آخر اسلامی دنیا میں سائنس کیوں ختم ہو گئی۔ یہ زوال ۱۱۰۰ء کے آس پاس شروع ہوا اور آئندہ ڈھائی سو برسوں میں مکمل ہو گیا۔

کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ بے شک، بہت سی خارجی وجوہات بھی تھیں جیسے منگولوں کی لائی ہوئی تباہی و بربادی، لیکن میرے خیال میں سائنس کا زوال اسلامی دنیا میں اس سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور اس کا سبب بہت سے اندرونی حالات تھے۔ سب سے پہلے تو اپنے آپ میں محدود ہونے والی وہ کیفیت جس نے سائنسی کارروائیوں کا رشتہ باقی دنیا سے توڑ دیا اور دوسری طرف تخلیقی طرز فکر کی ہمت شکنی اور اس کی جانب منفی رویہ نے زیادہ نقصان پہنچایا اور تخلیقی طرز فکر کو عام کیا۔ گیارہویں صدی کے اختتام اور بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں دنیائے اسلام سخت مذہبی گروہ بندیوں اور سیاست دانوں کی شہ پر بڑھتی ہوئی تنگ نظری کا شکار تھی۔ اور اسی دور سے دنیائے اسلام کے زوال کی بنیاد پڑی۔ حالانکہ امام غزالی بھی ۱۱۰۰ء کے آس پاس یہ لکھ سکتے تھے۔ "مذہب کے خلاف سب سے بڑے جرم کا ارتکاب وہ لوگ کرتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام کا دفاع علوم ریاضی کے انکار سے بھی ہو سکتا ہے۔ جب کہ ان علوم میں کوئی بات بھی مذہب کے خلاف نہیں ہے" لیکن زمانہ کا مزاج تخلیقی علوم کے خلاف ہو چکا تھا۔ ہر طرف کٹر پن کا رواج اور رواداری کا فقدان تھا جس کا اثر یہ ہوا کہ تقلید عام ہوئی اور اجتہاد کا دروازہ تمام علوم پر بند ہوا جن میں سائنسی علوم بھی شامل تھے۔

کیا حالت اب بھی یہی ہے؟ کیا ہم اب سائنسی تحقیقات کی ہمت افزائی کرنے لگے ہیں؟

روئے زمین کی اہم تہذیبوں میں سائنس سب سے کمزور اسلامی دولتِ مشترکہ میں ہے۔ بدقسمتی سے ہم میں سے بہت سے مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ علم حرفت یعنی ٹیکنالوجی بنیادی طور سے مغرب رہے اور اس کی زیادتی کا مدد اور اسلام کی اخلاقی [illegible]

تعلیمات پر عمل سے کیا جا سکتا ہے، لیکن سائنس کا معاملہ بالکل مختلف ہے کیونکہ اس سے کچھ قدریں بھی وابستہ ہیں۔ یہ خیال ہے کہ جدید سائنس عقلیت کا راستہ دکھاتی ہے جو لامذہبیت کی طرف جاتا ہے۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ ہم میں سے جو سائنس داں ہیں وہ ایک دن ہماری تہذیب کے مابعد الطبیعاتی مفروضوں سے منحرف ہو جائیں گے۔ قطع نظر اس کے کہ اعلیٰ صنعت و حرفت بغیر اعلیٰ سائنس کے پنپ نہیں سکتی اور اس توہین سے بھی قطع نظر جو ہماری تہذیب کے مابعد الطبیعاتی مفروضات اور فکری انجماد کو ہم معنی بنا دینے سے ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنس کی طرف یہ رویہ ان پرانے جھگڑوں کی وراثت ہے، جن میں نام نہاد عقلی گروہ کے وہ فلسفی الجھے ہوئے تھے، جنھوں نے ارسطو کے تصور کائنات کو بے چون و چرا مان لیا تھا اور جو ان میں کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے اور انھیں ان خیالات کو اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ یکجا کرنے میں مشکلیں پیش آ رہی تھیں۔

یہاں ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے بلکہ اس سے بھی شدید جھگڑوں میں قرونِ وسطیٰ کے عیسائی اہل مکتب مبتلا تھے۔ اہل مکتب کے لئے سب سے اہم مسائل تصور کائنات اور مابعد الطبیعات سے متعلق تھے۔

"کیا دنیا کسی غیر متحرک جگہ میں واقع ہے؟" کیا خدا محرکِ اول کو خود براہِ راست حرکت میں لانے کا محض ایک سبب ہے یا وہ مسبب الاسباب اور آخری وجہ ہے؟ کیا تمام افلاک کا محرک ایک ہی ہے یا مختلف؟ کیا وہ محرک جو کائنات کو حرکت میں لاتے ہیں کبھی تھک بھی سکتے ہیں؟ جب گلیلیو نے کوشش کی کہ پہلے ان مسائل کی فہرست تیار کرے جن کا تعلق محض طبیعات سے ہے اور اس کے بعد ان مسائل کو طبیعاتی تجربات کی مدد سے حل کرے تو وہ احتساب کی زد میں آ گیا۔ اس احتساب نے اٹلی میں سائنس کی ترقی کو کم از کم اٹھارہویں صدی تک تو روکے ہی رکھا۔ اب ساڑھے تین سو برسوں کے بعد نظریاتی تو آبادکاری ہو رہی ہے۔

ویٹیکن (VATICAN) کی ایک مخصوص تقریب میں عالی جناب جان پال ثانی نے یہ اعلان کیا "کلیسا تجربوں اور غور و فکر سے خود سبق لیتا ہے۔ آج یہ بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ تحقیقات میں آزادی کے کیا معنی لئے جائیں۔ انسان تحقیق کے ذریعہ ہی سے حق کی طرف آتا ہے۔ اسی لئے کلیسا کو یقین ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں ہے"۔ بہرحال عاجزانہ اور انتھک غور و فکر کے بعد ہی کلیسا مذہب کی روح کو کسی عہد کے سائنسی نظام فکر سے ممیز کر سکتا ہے۔

۴۔ سائنس کی تنگ دامانی

جو اقوال میں نے اوپر نقل کئے ہیں ان میں پاپائے اعظم نے اس بالغ نظری پر زور دیا ہے جو کلیسا نے سائنس کے ساتھ معاملات میں حاصل کی۔ اگر وہ چاہتے تو اس بات کو الٹ کے بھی کہہ سکتے تھے کہ گیلیلو کے وقت سے آج تک سائنسی نظریات میں اس معنی میں پختگی آئی ہے کہ سائنسداں اپنے حدود سے واقف ہو گئے ہیں۔ انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ بعض مسائل ایسے ہیں جو آج بھی ان کے دائرۂ فکر سے باہر ہیں اور مستقبل میں بھی یہی صورت رہے گی۔ سائنس کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اس نے اپنا دائرۂ عمل ایک خاص قسم کی تحقیق تک محدود کر لیا ہے۔ اور اس محدود دائرہ میں بھی آج کا سائنسداں جانتا ہے کہ وہ کہاں سے قیاس کے میدان میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس میدان میں وہ کبھی قطعیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ طبیعات میں اس صدی کے شروع میں دو مرتبہ ایسا ہوا۔ پہلے تو اس نظریہ کے نتیجے میں جس میں زمان و مکان میں نسبت اضافی بتائی گئی ہے اور دوسرے کوانٹم (QUANTUM) نظریہ کے سلسلے میں یہ صورت پھر پیش آ سکتی ہے۔

آئنسٹائن (EINSTEIN) کی وقت کے اضافی ہونے کی تحقیق ہی کو لیجئے۔ یہ بات بالکل قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ کسی وقفہ کے طول کا دار و مدار ہماری رفتار پر ہے۔ عمر ہی کے وقفہ کو لیجئے۔ ایک ایسے شخص کی نظر میں جس کی رفتار ہم سے کم ہے ہماری عمر اتنی ہی لمبی ہوتی جائے گی جتنی کہ ہماری رفتار تیز ہو گی۔ اسے قیاس آرائی نہ سمجھا جائے۔ آپ ذرا ہمارے ساتھ جنیوا میں واقع سرن (CERN) کی تجربہ گاہوں تک چلئے جہاں ذراتی طبیعات پر کام ہو رہا ہے۔ وہاں ایسے ذرات تیار کئے جاتے ہیں جن کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ ان میں میوآن (MUONS) نامی ذرات بھی ہیں۔ آپ ایک ریکارڈ تیار کیجئے اس وقفہ کا جس میں مختلف رفتار سے چلنے والے میوآن فنا ہو کر الیکٹرون اور نیوٹران بن جاتے ہیں۔ آپ دیکھئے گا کہ تیز رفتار میوآن دیر میں فنا ہوتے ہیں اور سست رفتار میوآن جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ ناقابل یقین لیکن بالکل سچ۔

آئنسٹائن کے زمان و مکان کے نظریات نے طبیعات کے عالموں میں ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔ ہم لوگوں کو طبیعات سے متعلق اپنے طرز فکر میں بہت سی تبدیلیاں کرنا پڑیں لیکن تعجب اس پر ہوتا ہے کہ بیشتر فلسفی جو انیسویں صدی تک زمان و مکان سے متعلق نظریات کو صرف اپنی ملکیت سمجھتے تھے اب تک آئنسٹائن کے مشاہدات کی روشنی میں کوئی فلسفیانہ نظام فکر نہیں بنا سکے۔

دوسرا اور زیادہ دھماکہ خیز ذہنی انقلاب ۱۹۲۶ء میں ہائزن برگ (HEISENBERG) کی اس تحقیق سے ہوا کہ یقینی علم کے حصول کے بھی حدود ہیں۔ ہائزن برگ کے اصول غیر یقینیت (UNCERTAINTY PRINCIPLE) کی رو سے مثلاً یہ بات کسی طور نہیں معلوم کی جا سکتی کہ سامنے کی میز پر ایک ساکت الیکٹرون ایک خاص مقام پر موجود ہے۔ ایسے تجربے ضرور کئے جا سکتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ الیکٹرون کہاں ہے۔ لیکن یہی تجربے یہ معلوم کرنے کا ہر امکان ختم کر دیں گے کہ الیکٹرون حرکت میں بھی ہے۔ اور اگر حرکت میں ہے تو کس رفتار سے۔ اس کو اگر الٹ کر کہیں تو یہ کہا جائے گا کہ کسی شے کے متعلق ہمارے علم کی بھی ایک حد ہے اور اس حد کا تعین اس شے کی فطرت سے وابستہ ہے۔ میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ اگر ہائزن برگ قرونِ وسطیٰ میں ہوتا تو اس کا کیا انجام ہوتا۔ کیسی کیسی مذہبی بحثیں اس مسئلہ پر اٹھتیں کہ آیا یہ حد اس علم پر بھی لگائی جا سکتی ہے جو خدا تعالیٰ کو ہے۔

جیسا کہ ہونا تھا معرکے ضرور گرم ہوئے لیکن صرف بیسویں صدی کے علمائے طبیعات کے درمیان۔ ہائزن برگ کے انقلابی نظریات تمام علمائے طبیعات کے لئے قابل قبول نہیں ہیں۔ اگرچہ اب تک جتنے بھی تجربے کئے گئے ان کی تصدیق ہی ہوئی لیکن طبیعات کے ممتاز ترین عالم آئنسٹائن نے بلاشبہ اپنی عمر کا سب سے قیمتی حصہ اس جستجو میں صرف کیا کہ ہائزن برگ کے نظریات میں کوئی نقص نکلے۔ وہ تجربات کے نتائج کا انکار تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن انھیں یہ امید تھی کہ ان نتائج کی علمی توجیہہ کچھ اور کی جا سکے گی۔ ابھی تک ایسی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکی۔ لیکن کوئی خصوصاً ایک ماہر طبیعات، یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کہانی یہیں ختم ہوتی ہے۔

۵۔ ایمان اور سائنس

سوال یہ ہے کہ کیا سائنس اور مابعد الطبیعات کی سیدھی ٹکر آج کل ناگزیر ہے؟ اور یہ بھی صحیح ہے کہ معاملہ سائنس اور اسلام ہی کا نہیں ہے بلکہ سائنس اور ہر طرح کے ایمان کا ہے۔ بشرطیکہ یہ تسلیم کیا جائے کہ اسی قسم کا کوئی معاملہ ہے بھی۔ کیا ایمان اور سائنس کا ساتھ ساتھ گزارا ہو سکتا ہے؟ اس سوال سے متعلق جدید سائنسی طرز فکر سے کچھ مثالیں آپ کے سامنے پیش ہیں:

پہلی مثال کے طور پر مابعد الطبیعات کے اس عقیدہ کو لیجئے کہ تخلیق بغیر شے کے ہوئی۔ آج کل بہت سے علم کائنات کے ماہرین یقین کرتے ہیں کہ کائنات میں مادہ و توانائی کی کثافت کی ممکنہ قیمت کچھ یوں ہے کہ کائنات میں مادے کی کل مقدار صفر آتی ہے۔ اگر مادہ کی مقدار واقعی صفر ہے اور اس مقدار کی پیمائش بھی ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حالت خلاء کی طرح کائنات بھی بے مادہ ہے۔ دس برس ہوئے کسی نے بڑی جرأت سے معاملہ کو اور آگے بڑھا کر یہ خیال ظاہر کیا کہ کائنات محض خلاء کی ارتعاشی شکل ہے گویا کہ یہ لاشے کی ایک کیفیت ہے جو زمان و مکان میں بغیر کسی شے کے تخلیق کی گئی ہے۔ لیکن طبیعات اور مابعد الطبیعات میں جو فرق ہے وہ یہ کہ طبیعات میں کائنات کے مادہ کی کثافت ناپی جا سکتی ہے، اور اس ناپ کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر کثافت کی پیمائش سے معلوم ہوا کہ نظریاتی نتیجہ غلط ہے تو پھر یہ نظریہ رد کر دیا جائے گا۔

میں دوسری مثال میں اس جوش و خروش کی طرف اشارہ کروں جس کا مظاہرہ ابھی حال میں اس وقت ہوا جب ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ فطرت کی دو بنیادی قوتیں برق مقناطیسی اور خفیف نیوکلیائی قوتیں اصل میں ایک ہی ہیں۔ اب ہم اس امکان پر غور کر رہے ہیں کہ زمان و مکان کے ابعاد دس (ایک اور شرح کے مطابق گیارہ) ہیں۔ اس نظریہ کے پس منظر میں ہمیں امید ہوتی ہے کہ ہم خفیف برقی قوت کو باقی دو بنیادی قوتوں یعنی کشش ثقل اور قوی نیوکلیر قوتوں کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان دس ابعاد میں سے چار ابعاد زمان و مکان کے ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔ ہماری کائنات کی وسعت اور اس کی عمر کا حساب اس خمیدہ خط سے لگایا جا سکتا ہے جو ان چار ابعاد زمان و مکان کو ملا کر کھینچا جائے۔ اور نو دریافت چھ ابعاد کی مدد سے جو خط خمیدہ بنے گا اس سے برقی اور نیوکلیر چارجوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آخر ہم لوگ نئے حدود کو براہ راست کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے سمجھنے کے لئے بالواسطہ طریقہ ہی کیوں ضروری ہے جس کے لئے برقی اور نیوکلیر چارجوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور پھر جانے پہچانے زمان و مکان کے چار ابعاد اور نو دریافت داخلی ابعاد میں فرق کیوں ہے۔ ہمارے موجودہ اندازہ کے مطابق ان کی جسامت ۳۲-۱۰ سنٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہے۔

فی الحال ہم نے اس کو قابل یقین بنانے کے لئے ایک قسم کے نظریۂ خود استقامت (SELF CONSISTENCY) سے کام لیا ہے ہم ایک ایسے میدانِ قوت کے وجود کا تصور کرتے ہیں جس کی مدد سے ایک پائیدار اور مستحکم کائناتی نظام کا وقوع ممکن ہو سکے۔ نظریہ اسی وقت کامیاب سمجھا جائے گا جب زائد ابعاد کی تعداد صرف چھ (یا نظریہ کی دوسری تشریح کے مطابق صرف سات) ہو۔ اور پھر کچھ ہلکے سے اور خفیف مادی نتائج بھی باقیات کی طرح ملیں جیسے حال ہی میں دریافت ہوئی تین درجہ حرارت والی سیاہ جسمی (BLACK BODY) شعاعیں جو کائنات کو پُر کئے ہوئے ہیں، اور جن کے متعلق ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ کائنات کے ارتقاء کے اوائل کے باقیات ہیں۔ ہم ان باقیات کو تلاش کریں گے اگر اس تلاش میں ناکام رہے تو اپنے نظریہ کو خیرباد کہہ دیں گے۔

بغیر کسی شے کے تخلیق، زائد ابعاد اور ان سب کا ذکر بیسویں صدی کی طبیعات میں عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو پرانے زمانہ میں مابعد الطبیعاتی مباحثہ کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ طبیعات میں ہر نظریہ صرف عارضی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور اس پر اصرار ہوتا ہے کہ ہر قدم پر اسے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے اطلاق کے حدود کا تعین کر لیا جائے۔

ایک متشکک (AGNOSTIC) کی نگاہ میں اس نظریۂ خود استقامت کی کامیابی (اگر ثابت ہوئی) عقیدۂ وجود خدا کے بے معنی ہونے کے مترادف ہو سکتی ہے۔

فَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ (وہ جسے گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا)۔

لیکن اہل ایمان کے لئے یہ ان کے رب العالمین کے کسی بڑے منصوبہ کا محض ایک جز ہے جس کے تحت ظہور رہا ہے جس شکل میں ہو ان کی نگاہوں کو منور کر دیتا ہے اور وہ وارفتہ وار اس کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔

ہائنس پے جل (HEINZ PAGELS) اس زمانہ کے غالباً سب سے ممتاز سائنس داں فائن مین (FEYNMAN) کے متعلق ایک قصہ سناتے ہیں۔ "وہ مدہوشی کی سی کیفیت میں تھے کہ انھیں ایک غیر مادی تجربہ ہوا۔ انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اپنے بدن سے باہر آ گئے ہیں اور ان کا جسم ان کے سامنے پڑا ہے۔ یہ یقین کرنے کے لئے کہ انھیں جو محسوس ہو رہا وہ حقیقت ہے انھوں نے اپنے ہاتھ کو جنبش دینا شروع کی اور انھوں نے کہا کہ جب میں نے یہ دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں اپنے جسم کے باہر ہی نہ رہ جاؤں اس لئے یہ طے کیا کہ اس میں فوراً واپس چلا جاؤں"۔ یہ قصہ سن کر میں نے ان سے پوچھا کہ اس عجیب واقعہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ فائن مین نے ایک ماہر سائنس داں کی نپی تلی زبان میں جواب دیا "میں نے اس میں طبیعات کے کسی قانون کو رد ہوتے ہوئے نہیں دیکھا"۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ ان معاملات میں جن میں طبیعات خاموش ہے میرا ایمان اسلام کے رہنما ہونے والے پیغام پر ہے۔ اس کا صاف اشارہ تو سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی آیت میں موجود ہے "یہ کتاب بلاشبہ راستہ دکھاتی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو ان دیکھی پر ایمان لاتے ہیں"۔

ان دیکھی انسان کی آنکھوں سے اوجھل۔ وہ جس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اصل عربی الفاظ میں

یومنون بالغیب (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں)

(باب دوم)

اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس اور حرفت کس حالت میں ہے؟ شناخت کے لئے اسلامی عوام کو چھ جغرافیائی منطقوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے منطقہ میں جزیرہ نمائے عرب اور خلیج فارس کے نو ممالک ہیں۔ دوسرے خطہ میں شمالی عرب کے سیریا، اردن، لبنان، فلسطین کا مغربی کنارہ اور غازہ کے ممالک آتے ہیں۔ تیسرے علاقہ میں ترکی، مسلم وسط ایشیا، ایران، افغانستان اور پاکستان واقع ہیں۔ چوتھے گھنی آبادی والے علاقے ہیں بنگلہ دیش، ملیشیا اور انڈونیشیا ہیں۔ اسی علاقہ میں ہندوستان اور چین کی کثیر تعداد والی مسلم اقلیتیں بھی ہیں۔ پانچویں علاقہ میں شمالی افریقہ کی ریاستیں ہیں اور چھٹے حصہ میں افریقہ کے غیر عرب ممالک شامل ہیں۔

اگر ہم اٹھارہ سال سے چوبیس سال کی عمر کے لوگوں سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین میں داخل ہونے والوں کی تعداد کو اور ان سے سائنس کے ذخیرو کا اندازہ لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ممالک میں اس عمر کے لوگوں میں سے صرف دو فیصد یونیورسٹی کے سائنس کے شعبوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک میں اس آبادی کا ۱۲ فیصد حصہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔

بس ایک اور چھ (۱۱:۶) کا تناسب مسلم دولت مشترکہ اور ترقی یافتہ ممالک کے صرف میں ملتا ہے جو وہ اپنی قومی پیداوار میں سے سائنس اور حرفت یعنی ٹیکنالوجی کی تحقیقات پر کرتے ہیں۔ جو لوگ سائنسی تحقیقات میں مصروف ہیں ان کے متعلق تفصیلی اعداد و شمار ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن اسلامی کانفرنس تنظیم کے سائنٹفک کمیشن کے پہلے اجلاس میں جو ۱۰-۱۲ مئی ۱۹۸۳ء میں ہوا تھا ایک رپورٹ پیش کی گئی تھی جس کے مطابق ساری دنیائے اسلام میں صرف ۴۵ ہزار سائنس اور انجینیرنگ کے محقق ہیں بمقابلہ پندرہ لاکھ محققوں کے جو سوویت یونین میں ہیں اور چار لاکھ کے جو جاپان میں ہیں۔

امریکن یونیورسٹی بیروت کے ایک معلم اے بی زہلان نے تحقیق کر کے اندازہ لگایا ہے کہ جہاں تک طبیعات کا تعلق ہے ترقی یافتہ ممالک کے سائنسدانوں کی تعداد کا صرف دسواں حصہ اسلامی دنیا میں ہے اور سائنسی تخلیقی کاموں میں ان کا حصہ ترقی یافتہ ممالک کے کاموں کا صرف ایک فیصد ہے۔ یہ اندازہ شائع شدہ تحقیقاتی مضامین کی تعداد پر مبنی ہے۔

پاکستان کا شمار اسلامی دنیا میں سائنسی میدان میں سب سے آگے رہنے والے ملکوں میں ہے۔ وہاں ۱۹۸۲ء میں انیس یونیورسٹیاں تھیں۔ لیکن ان میں صرف تیرہ طبیعات کے پروفیسر تھے اور صرف بیالیس پی۔ ایچ۔ ڈی اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والے تھے۔ اگر یہ ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کی کل آبادی آٹھ کروڑ ہے اور اس کے بعد انگلستان کے صرف ایک کالج "امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی" سے مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ صرف اسی کالج میں بارہ پروفیسر اور سو تحقیقی کام کرنے والے ہیں۔

اب ذرا ایک باہر سے تماشہ دیکھنے والے کا تاثر ملاحظہ ہو۔ فرانسیس گائلز (FRANCIS GILES) مارچ ۱۹۸۲ء کے مشہور سائنسی جریدے "نیچر" کے شمارہ میں لکھتے ہیں۔

"آخر مسلم سائنس میں کیا خرابی ہے؟ ایک ہزار سال پہلے جب مسلم دنیا نقطۂ عروج کو پہنچی ہوئی تھی اس نے سائنس میں بے بہا اضافے کئے۔ خاص کر ریاضی اور طب میں۔ بغداد اور جنوبی اسپین میں ایسی یونیورسٹیاں تھیں جہاں لوگ ہزاروں کی تعداد میں رہتے تھے۔ یہ زمانہ ان کے عروج کا تھا۔ زمانہ میں ان کے حکمران سائنس دانوں اور فنکاروں میں گھرے رہتے تھے اور آزادی کی ایسی ہوا چل رہی تھی کہ اس میں یہودی، عیسائی اور مسلمان سب ساتھ سانس لیتے اور کام کرتے تھے۔ اب یہ سب کچھ خواب ہے۔"

جو رقم سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کی جاتی ہے اس میں گذشتہ چند برسوں میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن یہ اضافہ صرف تیل پیدا کرنے والے ملکوں تک ہی محدود ہے۔ غالباً یہ ناگزیر بھی ہے۔ لیکن ان میں سے بعض لڑائیوں میں مصروف ہیں جن میں کروڑوں ڈالر ضائع ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد سائنس کی ترقی کے لئے بہت کم بچتا ہے۔ تجارت کا انتظام پوری طرح درآمد کی ہوئی ٹیکنالوجی کے شکنجے میں ہے اور سائنسی نظام میں بھی تخلیق کے بجائے منقولات کی کارفرمائی ہے۔

تیل کی برآمد سے حاصل ہوئی نئی دولت کا بھی بہت زیادہ اثر نہیں پڑا ہے یہ بات اگرچہ سائنس دانوں کو بہت بری لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سیاست اور سائنس کی پالیسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس علاقہ میں شخصی استبداد کا تسلط ہے اس میں کہیں رحم دلی ہے اور کہیں حالت اس کے برعکس ہے۔ اس لئے جب بھی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سائنس اس سرزمین میں جڑ پکڑے تو دشواریاں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس علاقہ سے ترقی یافتہ ملکوں کی طرف جو ذہنی ہجرت جاری ہے اس سے سارے مشرق وسطیٰ میں علمی حالت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔"

بڑی سخت تنقید ہے یہ! لیکن جن لوگوں پر کی گئی ہے وہ اسی قابل ہیں اور یہ تنقید حقیقت پر مبنی ہے۔

نیچر (NATURE) کے اسی شمارہ میں ایک مضمون اسرائیل کی تحقیقی مردم شماری کے بارے میں بھی ہے جس کا اقتباس میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

"اس ضرورت کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ علمی اعتبار سے تربیت یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ کی ضرورت ہے۔ تحقیق اور ترقی کی قومی کونسل نے تجویز پیش کی ہے کہ ۱۹۹۵ء تک چھیاسی ہزار سات سو (۸۶۷۰۰) ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوگی بمقابلہ ۱۹۷۸ء کے جب ایسے لوگوں کی کل تعداد چونتیس ہزار آٹھ سو (۳۴۸۰۰) تھی۔ ڈیڑھ سو فیصدی اضافہ ذرا اسرائیل کے (۳۴۸۰۰) تربیت یافتہ لوگوں کو مقابلہ اسلامی ممالک کے پینتالیس ہزار (۴۵۰۰۰) ایسے ہی افراد سے کیجئے اور یہ دھیان میں رکھئے کہ دونوں جگہوں کی آبادی کا تناسب ایک اور دو سو (۱:۲۰۰) کا ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

(پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو)

آگے چل کر اسی مضمون میں لکھا ہے:

"۱۹۶۰ء کی دہائی میں ییل یونیورسٹی (YALE UNIVERSITY) کے پروفیسر ڈیرک ڈی سولا پرائس نے سائنٹفک افراد کی تعداد کا اندازہ ان مضامین کی اشاعت سے لگایا جو معیاری علمی رسالوں میں چھپتے ہیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس ملک میں اس تعداد کے مقابلے میں پانچ گنا تربیت یافتہ افراد ہیں۔ جس کی توقع ملک کی تمام پیداوار و آبادی کے تناسب پر ہوتی ہے۔ پرائس کا اصرار ہے کہ صورت حال آج بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ملک میں اب بھی تربیت یافتہ افراد کی ایک زبردست جماعت محفوظ ہے اور یہ بات ایسی ہے جس پر بہت شکر کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کے سائنس دان اور کاریگر اس کے تیل اور معدنیات کے فقدان کی نہ صرف تلافی کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔

۷۔ اسلام میں سائنس کا نشاۃ ثانیہ

کیا ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دوبارہ سائنس میں برتری حاصل کر سکتے ہیں۔ میں بہت عاجزی سے گذارش کروں گا کہ یہ ممکن ہے بشرطیکہ پورا سماج اور خصوصاً ہمارے نوجوان اس کو اپنا مقصد بنالیں کہ اس کی بنیاد ہماری نظریاتی روایتوں میں اور خود ہمارے قرون اولیٰ کے تجربوں میں ہے لیکن ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس نشاۃ ثانیہ تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔ یہ مقصد جبھی حاصل ہوگا جب ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اس کی تمنا بیدار ہو جائے اور پوری قوم اس کا بیڑہ اٹھائے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ قوم اپنے کام کرنے والے افراد میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں کو سائنس کی اعلیٰ تربیت دینے کا انتظام کرے اور قومی پیداوار کا ایک سے دو فیصد حصہ بنیادی اور کام میں آنے والی سائنس کی ترقی کے لئے مخصوص کر دے اور اس رقم کا کم سے کم ایک چوتھائی سے ایک تہائی تک کا حصہ صرف بنیادی سائنس پر خرچ کرے۔

یہ سب جاپان میں ہو چکا ہے، جب وہاں کے شہنشاہ نے میجی کے انقلاب کے زمانہ میں یہ قسم کھائی تھی کہ علم روئے زمین کے جس کونے سے بھی حاصل کیا جا سکے حاصل کیا جائے۔ یہ سب سوویت یونین میں بھی ساٹھ برس پہلے ہو چکا ہے جب پیٹر اعظم (PETER THE GREAT) کی قائم کردہ سوویت اکیڈمی آف سائنس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے ممبروں کے حلقہ کو وسیع کرے اور سائنس کے ہر شعبہ میں سبقت حاصل کرنے کا حوصلہ کرے۔ آج اس کے مختلف اداروں میں پانچ لاکھ سائنس داں کام کر رہے ہیں۔ اور انہیں کام کرنے کی جو سہولتیں حاصل ہیں اور ان کے کاموں کو جو اولیت دی جاتی ہے اس پر باقی دنیا رشک کرتی ہے۔ اکیڈیمیشین مال سیو (MALCEV) کہتے ہیں کہ یہ زیادہ تر ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ ہوا جب سوویت یونین کی معیشت لڑائی میں تباہ ہو چکی تھی۔ اسٹالن نے اس زمانہ میں طے کیا کہ سائنس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور بغیر کسی سے مشورہ لئے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ سائنس دانوں اور اہل حرفت کی آمدنی میں تین سو فیصدی کا اضافہ کر دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ذہین نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جوق در جوق سائنس کے تحقیقی میدان میں آئیں۔ سائنس پر اسی طرح کا زور آجکل عوامی جمہوریہ چین میں دیا جا رہا ہے۔ وہاں یہ منصوبہ بنایا گیا ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک وہ لوگ برطانیہ سے خلائی سائنس جینیٹکس، مائکرو الیکٹرانکس، ہائی انرجی فزکس، فیوژن فزکس اور تھرمو نیوکلیر انرجی کو قابو میں لانے والے میدان میں آگے بڑھ جائیں گے۔ چینیوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ تمام بنیادی سائنس ضروری ہیں اور آج کی سائنس کی سرحد بنیاد بنے گی کل کی اس سائنس کی جسے کام میں لایا جائے گا۔ اور ضرورت اس کی ہے کہ ہمیشہ سائنس کی آخری سرحدوں پر کام کیا جائے۔ یہاں ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اسلامی ممالک کی قومی پیداوار چین کی قومی پیداوار سے زیادہ ہے اور چین کو ہم سب پر صرف چند باتوں کی برتری حاصل ہے۔ ہم کیوں نہ ٹھان لیں کہ چین کے اس راستہ پر ہم بھی چلیں گے۔

جن معاشروں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں سے کہیں بھی لوگ چینی جاپانی یا روسی سائنس کے خبط میں نہیں مبتلا ہیں کیونکہ وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان نعروں سے لوگ بہک جاتے ہیں۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر معاشرہ میں سائنس کی مختلف شاخوں میں سے بعض پر زیادہ زور دیا جائے گا اور بعض پر کچھ کم۔ ان شاخوں کا انتخاب تو مقامی ضرورت کے مطابق کیا جائے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کے قوانین اس کی روایتیں اور طریقہ کار ساری دنیا کے لئے ایک جیسے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی بلحاظ مقام کے نہیں ہوتی۔ ان کو یہ ڈر نہیں لگتا کہ مغربی سائنس اور ٹکنالوجی سے ان کا مخصوص کلچر تباہ ہو جائے گا وہ اپنی روایتوں کو اتنا حقیر اور کمزور بیان کر ان کی توہین نہیں کرتے۔

میں اس سے قبل سائنس کی سرپرستی کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سائنس کے عالموں کو اپنے کام کا تسلسل برقرار رکھنے کی ضمانت مل جائے اور وہ اپنے کام کو محفوظ سمجھیں۔ آج کل یہ حال ہے کہ ایک عرب یا مسلمان سائنس داں اگر ذری قابلیت رکھتا ہے تو اسے پورا یقین ہے کہ وہ ممالک متحدہ امریکہ اور انگلستان میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور عمر بھر وہاں اس کا خیر مقدم ہوگا۔ وہاں اسے حفاظت عزت اور کام کرنے کا برابر کا موقع یہ سب چیزیں ملیں گی۔ ہم لوگوں کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ کیا یہ سب باتیں ہمارے معاشرہ میں بھی ممکن ہیں۔ اور ہمیں اپنے آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہئے کہ کہیں ہم اپنے سائنس دانوں میں تفریق تو نہیں کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کی ملازمت محض اس لئے ختم کر دیتے ہیں کہ ان کی پیدائش کسی ایسے ملک میں ہوئی ہے جہاں کی حکومت سے ہمارے کچھ عارضی اختلافات پیدا اس میں کوئی شک نہیں کہ ممالک متحدہ امریکہ نے سائنسی میدان میں اپنی موجودہ برتری بہت ہی کم وقت میں حاصل کی۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ اس نے ان سائنس دانوں کا خیر مقدم کیا جو دو عالمی جنگوں کے درمیان کے زمانہ میں یورپ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن اس خیر مقدم میں کوئی نمائش داری نہیں تھی۔ ان سائنس دانوں کو حقوق شہریت دیئے گئے اور یہ شرط نہیں تھی کہ وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد اپنے وطن واپس چلے جائیں گے۔ ان سائنس دانوں نے انگریزی سیکھی اور ممالک متحدہ میں ان کے خاندان پھلے پھولے این ریکو فرمی (ENRICO FERMI) کے متعلق یہ قصہ تو عام طور سے مشہور ہے کہ اسٹاک ہام (STOCK HOLM) کی تقریب کے فوراً بعد ہی وہ نوبل پرائز کے روپیہ سے اپنا اور اپنے خاندان کا ٹکٹ خرید کر امریکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ان سے کہا گیا کہ وہ ایٹمی ری ایکٹر چلائیں یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب ان کے پاس رہنے کی سرکاری اجازت نہیں تھی اور ارباب حل و عقد کی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس معاملہ میں جلدی کریں کیونکہ اندیشہ تھا کہ اس سے محوری طاقتوں کی خفیہ تنظیمیں چوکنا ہو جائیں گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ملک میں بھی ممتاز ترین سائنس دانوں کی طرف یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے؟ کیا ہم ان عالموں کو اتنی ہی حفاظت اور اطمینان کا یقین دلا سکتے ہیں۔ کیا ہم ان کا استقبال بھی ایسی ہی گرمجوشی سے کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے لئے جی جان سے کوشش کر کے تحقیقی ادارے قائم کر دیں؟

میری رائے میں ضرورت اس کی ہے کہ سیاسی دولت مشترکہ کے بننے کا انتظار کئے بغیر اسلامی ممالک میں سائنس کی دولت مشترکہ بنائی جائے ایسی سائنسی دولت مشترکہ اسلامی سائنس کے شاندار ماضی میں موجود تھی جب وسط ایشیا کے رہنے والے ابو سینا اور البیرونی عربی ہی میں لکھتے تھے اور اس کو بالکل قدرتی بات سمجھتے تھے یا ان کے ہم عصر اور میرے طبیعاتی بھائی ابن الہیثم (IBN AL HAYTHEM) بغیر کسی اندیشہ کے خلفائے بنو عباس کی مملکت بصرہ سے ان کے رقیب بنو فاطمہ کے زیر نگیں مصر چلے گئے تھے کہ باوجود ہر قسم کے اختلاف کے (جس میں فرقہ وارانہ اختلاف بھی شامل تھا) وہاں انہیں عزت اور مرتبت ملے گی۔ یہ خیال رہے کہ اس زمانہ میں فرقہ وارانہ یا مذہبی اختلاف اتنے ہی شدید تھے جتنے کہ آج کل۔ اسلامی سائنس کی دولت مشترکہ کے لئے ضرورت ہے کہ ہم شعوری طور پر اس کے لئے کوشش کریں اور اس کوشش میں ہم دونوں یعنی اہل سائنس اور اہل حکومت برابر کے شریک ہوں۔ آج کل ہم سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بین الاقوامی معیار کے ایک فیصد سے کر زیادہ سے زیادہ دس فیصد تک اور یہی حالت ہمارے ذرائع اور علمی سرمایہ کی بھی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم سب متحد ہو کر اپنے ذرائع کو ملائیں اور سب ایک جماعت بنا کر سائنس کے تحقیقاتی اداروں کو تمام اسلامی ممالک میں پورے نظم و ضبط سے چلائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم حکومتوں کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ ایک عرصہ کے لئے مثلاً پچیس برسوں کے لئے کچھ خاص رعایتیں دیں جن کے سہارے ہمارے سائنس دانوں کو ایک محفوظ طبقہ سمجھا جائے اور وہ ممالک کے سیاسی فرقہ وارانہ جھگڑوں سے الگ رکھے جائیں تاکہ وہ ایک امت العلم کی طرح کام کر سکیں بالکل اسی طرح جس طرح ماضی میں سائنس کی اسلامی دولت مشترکہ میں کام ہوتا تھا۔

اور آخر میں اس پر غور کرنا ہے کہ ہماری سائنسی سرگرمیاں بین الاقوامی سائنس سے وابستہ نہیں ہیں۔ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے کہ سوائے مصر کے جو سولہ بین الاقوامی یونینوں یا تنظیموں کا ممبر ہے اور کوئی اسلامی ملک پانچ سے زیادہ بین الاقوامی سائنسی تنظیموں کا ممبر نہیں ہے۔ کوئی بین الاقوامی سائنسی مرکز ان ملکوں میں نہیں ہے اور بہت کم بین الاقوامی سائنس کانفرنسیں یہاں ہوتی ہیں۔ ہم میں سے ان لوگوں کو باہری سائنسی مرکزوں میں جانے کے یا کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے مواقع نہیں ملتے جو اسلامی ممالک میں کام کرتے ہیں۔ اس طرح کے سفر کو عیاشی سمجھا جاتا ہے۔

علیحدگی کے اس احساس ہی کی وجہ سے میرے دل میں بین الاقوامی سائنس کے ایسے مرکز بنانے کا خیال پیدا ہوا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنس داں بغیر اپنے گوجرا وطن کئے اپنے مضمون کے متعلق جدید ترین باتیں جان سکیں۔ یہ مرکز اقوام متحدہ کی دو ایجنسیوں کی ملکیت ہے۔ یہ دو ایجنسیاں آئی۔ اے۔ ای۔ اے اور یونیسکو ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے ایک ہزار ماہرین طبیعات میں سے تقریباً ۱۷۵ اسلامی ممالک کے سائنس دان یہاں ہر سال آتے ہیں اور ان کے قیام کا انتظام یہ ادارہ کرتا ہے ان میں سے پندرہ کی کفالت کویت فاؤنڈیشن فار سائنس اور کویت اور قطر کی یونیورسٹیاں کرتی ہیں۔ باقی کی کفالت میری کوششوں سے سویڈن اور اٹلی سے ہوتی ہے۔

اور معاملہ صرف ہمارے سائنس دانوں کی عالم سائنس سے جسمانی علیحدگی کا نہیں ہے۔ علیحدگی تو پورے سائنسی طریقہ کار سے ہے۔ ہمارے اور مغربی رویوں میں زبردست فرق ہے اور یہی فرق ہمارے اور سوویت اکیڈمی آف سائنس کے طریقہ کار میں بھی ہے۔ ہمارے یہاں پیشہ ورانہ تنظیموں کا کوئی ٹھیک نظام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی کمیٹی ہے جو سائنس کے کاموں کا مطالعہ اور ان پر تبصرہ کر سکے۔ اور نہ کوئی ادارہ ایسا ہے جو آزادی سے ہمارے علمی اور ادبی معیار کا جائزہ لے سکے اور نہ کوئی سائنس کا ایسا مرکز ہے جس کا انتظام سائنس داں ہی کرتے ہوں اور نہ ان کاموں کے لئے سرمایہ کا ایسا نظام جو سرکاری بندشوں سے آزاد ہو۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس کے احیاء کے لئے کم از کم پانچ شرطیں پوری ہونا چاہئیں یعنی اس مقصد سے شدید جذبہ، لگن، فیاضانہ سرپرستی، حفاظت کا انتظام، خود مختاری اور سائنسی کارکردگی میں بین الاقوامی نقطۂ نظر۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد:۱۲)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی ذاتی صلاحیت کو نہیں بدل دیتی۔

لیکن اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ اس کی مخالفت ضرور ہوگی۔ رونا تو اس کا ہے کہ مخالفت کرنے والے اسلامی شریعت و روایات کی حفاظت کا دعویٰ کریں گے۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور ان کے خیالات کی نمائندگی لندن سے شائع ہونے والے ایک کثیر الاشاعت رسالہ میں اس طرح کی گئی ہے۔

"کیا قرون وسطیٰ کی سائنس صحیح معنوں میں اسلامی سائنس تھی؟" اگر اس زمانہ کے سائنسدانوں مثلاً الکندی (AL-KINDI)، الفارابی (AL-FARABI)، ابن الہیثم (IBN-UL-HAITHAM) اور ابن سینا (IBN SINA) کے حالات دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ سوائے اس کے کہ وہ سب مسلمان تھے ان میں یا ان کی کتابوں میں کوئی اور بات اسلامی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کی زندگیاں واضح طور پر غیر اسلامی تھیں۔ ان کے طب، کیمیا، طبیعات اور فلسفیانہ کارنامے تدوین اور منطق نتیجہ تھے، یونانی طریقۂ فکر کے۔

"الکندی معتزلہ (MUTAZALITE) خیالات رکھتا تھا۔ ابن الہیثم ایک دوسرا ارسطو کا ماننے والا تھا۔ بقول مشہور سائنسی مورخ ڈی بور (DE BOER) "الہیثم مختلف نظریات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان میں سے ہر ایک میں سچائی تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔" اس کی نظر میں حقیقت صرف وہ ہے جس کا ادراک حواس سے ہو سکے۔ اس لئے اس میں تعجب کی کون سی بات ہے اگر اس کا شمار لامذہبوں میں ہوتا ہو اور اسی لئے آج انہیں دنیائے اسلام نے تقریباً بھلا دیا ہے:

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم بلاشبہ ایسی زبان میں باتیں کر رہے ہیں جو ایک دوسرے کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس ناقابل یقین حملہ کا نشانہ وہ ممتاز علمائے سائنس تھے جن پر سب مسلمان فخر کرتے ہیں اس کے بعد مصنف ایک ایسی حکمت عملی کی تلقین کرتا ہے جس نے ماضی میں ہماری سائنس کی روایات کو مٹا دیا تھا یہ حکمت عملی علیحدگی والی ہے۔

"وہ ممالک جو مغربی طاقتوں کے تسلط سے بچے رہے تھے اب یک طرفہ طور پر ایسی پالیسی اختیار کر رہے ہیں جو ان کے لئے کارآمد ہے۔ چین اور روس دونوں جگہ یہی حال ہے اور اگر کمانڈر پیری امریکہ سے تجارتی اشتراک کی شرط پر جاپان کو آزادی نہ دیتے تو جاپان کا بھی یہی رویہ ہوتا ..... مسلمان ملکوں کو بھی چاہئے کہ وہ ایسی سائنسی پالیسی اختیار کریں جو انہیں مغربی سائنس اور ٹکنالوجی کو خیرباد کہنے کے قابل بنا دے۔"

اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ

حکمت مومن کا کھویا مال ہے۔

جہاں تک ٹیکنالوجی کا معاملہ ہے مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ لیکن سائنس:

اس پر تو مجھے البیرونی کا وہ قصہ یاد آتا ہے کہ جب کسی ہم عصر مولوی نے ان پر کفر کا فتویٰ اس وجہ سے لگایا کہ انہوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس میں نماز کا وقت معلوم کرنے کے لئے بازنطین جنتری (BYZANTINE) سے مدد لی گئی تھی تو البیرونی نے بگڑ کر کہا: "بازنطینی تو روٹی بھی کھاتے ہیں تو کیا آپ روٹی کے خلاف بھی مذہبی اعتراض کریں گے؟"

(باب سوم)

وہ اقدام جو دنیائے اسلام میں سائنس کے احیاء کے لئے ضروری ہیں

۸۔ (الف) سائنس کی تعلیم

کلام پاک میں سات سو آیتوں میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ایک تفکر یعنی قوانین فطرت پر غور اور ان کی دریافت پر اور دوسرے تسخیر یعنی فطرت پر اپنے فن کی مدد سے قابو پانے پر۔ اس ارشاد خداوندی اور آج کل کے حالات کے پیش نظر پہلی بات جو امت کو کرنے کی ہے وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت کی ہمت افزائی ثانوی، آخری اور یونیورسٹی کے درجوں تک کی جائے۔

مختلف اداروں، مثال کے لئے عالمی بینک کے شائع کردہ اعداد و شمار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم پانے والوں میں سائنس میں داخلہ لینے والوں کی تعداد اسلامی ممالک میں دوسرے ترقی پذیر ممالک کے اوسط کو بھی نہیں پہنچتی ہے ترقی یافتہ ممالک سے مقابلہ کا تو ذکر ہی کیا۔

سائنسی اور غیر سائنسی شعبہ جات میں داخلہ کے تناسب کا کوئی اندازہ قابل بھروسہ اعداد و شمار کے بغیر ممکن نہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ سائنس میں داخلہ کا اوسط بہت ہی کم ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں تو شاید یہ ایک چوتھائی یا ایک تہائی کے برابر ہو اور جہاں تک معیار کا تعلق ہے تو وہ اور بھی کم ہے۔ مملکت متحدہ (یونائٹڈ کنگڈم) کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایک رپورٹ کے مطابق وہاں سائنس اور آرٹ کے طلباء کا تناسب ۴۸ : ۵۲ کا تھا (۱۹۸۴ء میں) اور جہاں تک چین اور جاپان کا معاملہ ہے وہاں ثانوی درجات میں سائنس کی تعلیم لازمی ہے۔ سوویت یونین میں موسیقار اور فٹ بال کھیلنے والے، سلائی کرنے والے کو بھی طبیعات اور کیمسٹری، ریاضی اور حیاتیات کی تعلیم ۱۶ برس کی عمر تک کے لئے لازمی ہے۔ لیکن اس طرح کی کوئی پابندی کسی اسلامی ملک مثال کے طور پر پاکستان میں نہیں ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت کم مسلمان سائنس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جس طرح بھی ہو ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو اسکول اور یونیورسٹی کے درجوں میں بڑھا دینا ہوگا۔

یہ تب ہی ہو سکے گا جب اسکول کے مرحلہ پر سائنس پڑھانے کا بندوبست کیا جائے۔ اور اس کے لئے لائق اساتذہ اور سائنسی سامان کی ضرورت ہوگی لیکن غالباً سب سے زیادہ ضرورت تو اس بات کی ہوگی کہ سائنسی تعلیم کو ہونہار طلباء کے لئے ایسا پرکشش بنایا جائے کہ وہ آگے چل کر اسے آسانی سے نہ چھوڑ سکیں۔ سائنس چھوڑ دینے کے واقعات بہت سے ہوتے ہیں اور اس کی بہت بڑی وجہ معاشی تنگ دستی ہے۔ والدین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی طویل تعلیم دلا سکیں جو پیشہ ور سائنس داں کے لئے ضروری ہے۔

امت میں سائنس کی تعلیم کے عام رواج کے لئے ایک ایسے سرمایہ کی ضرورت ہوگی جس سے ان نو عمر طلباء کی ہمت افزائی ہو سکے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں اور جن کی عمر چودہ برس کے آس پاس ہو۔ ہندوستان کے حالیہ ایک دورہ میں مسلمان ماہرین تعلیم سے ایک گفتگو کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ صرف شمالی ہندوستان کے بیس بڑے شہروں میں سائنسی تعلیم کے وظیفوں کے لئے تقریباً پچاس لاکھ ڈالر سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ اس حساب سے پانچ کروڑ ڈالر کا سرمایہ اگر فراہم ہو سکے تو پچاس لاکھ ڈالر سالانہ کے وظیفوں کا انتظام ہو سکے گا۔ بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمان معاشی اعتبار سے ایسی پستی میں ہیں کہ ان کے لئے اتنی بڑی رقم کی فراہمی ممکن نہیں ہے۔ اس سرمایہ کا انتظام تو ان کے لئے اور امت کے دوسرے غریبوں کے لئے کرنا پڑے گا۔

تمام دنیائے اسلام کے ہونہار طلباء کے وظائف کے لئے تقریباً پانچ کروڑ ڈالر سالانہ وظیفوں کی ضرورت ہوگی۔ اور چونکہ اتنے کثیر سرمایہ کی فراہمی امت کے لئے بہت آسان نہیں ہے۔ غالباً زیادہ تیل پیدا کرنے والے ممالک کو خود اپنے یہاں کے لئے اپنے وظائف کا انتظام کرنے میں فیاضی سے پہل کرنا ہوگی۔ اس کے بعد اس سرمایہ کے دروازے کو دوسرے مسلمان ملکوں کے لئے بھی کھولا جا سکتا ہے اور ان میں جغرافیائی اعتبار سے خاص مضامین کی تقسیم ہو سکتی ہے۔

۸۔ (ب) دنیائے اسلام کی سائنس کے لئے سرمایہ

۱۹۷۳ء میں میری تحریک پر حکومت پاکستان نے اسلامی ملکوں کی چوٹی کانفرنس سے لاہور میں درخواست کی کہ وہ ایک ارب ڈالر سے فاؤنڈیشن کے برابر سائنس کی ترقی کے لئے ایک سرمایہ کا انتظام کریں۔ اس کے آٹھ برس بعد صرف پانچ کروڑ ڈالر کا سرمایہ اکٹھا ہو سکا یعنی جتنا مانگا تھا صرف اس کا آدھا ملا۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ ہم اتنی چھوٹی سی رقم مہیا کر کے اپنے کو رسوا نہ کرتے۔ بہر حال جو میں نے ۱۹۷۳ء میں کہا تھا وہ میں آپ کے ملاحظہ کے لئے درج کر رہا ہوں۔

اسلامی سائنسی وقف

۱۔ تجویز یہ ہے کہ اعلیٰ معیار کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے اسلامی ممالک ایک وقف بورڈ بنائیں۔ اس وقف کا بندوبست رابطۂ اسلامی کی مدد سے سبھی ممالک کریں اور اس کا دائرۂ عمل بھی سبھی ممالک ہوں۔ اس کے لئے ایک ہزار ملین (یعنی ایک ارب) ڈالر کا سرمایہ فراہم کیا جائے جس سے سات آٹھ کروڑ ڈالر سالانہ کی آمدنی کی توقع ہو۔ یہ وقف بالکل غیر سیاسی ہو اور اس کا انتظام دنیائے اسلام کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کے ذمہ کیا جائے۔

۲۔ ضرورت

مشرق وسطیٰ یا مشرق بعید میں یا افریقہ کے مسلم ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار ایسا نہیں ہے کہ جس کا مقابلہ ترقی یافتہ ممالک سے کیا جا سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سماج اور حکومت دونوں معیار بلند کرنے کے معاملہ میں لاپرواہی برتتے ہیں۔ اب یہ بڑے ترقی یافتہ ممالک میں اقتصادی اعتبار سے مفید آبادی کا ۳ فیصد اعلیٰ سطح کی سائنس، ٹکنالوجی اور طب کی تحصیل علم میں مصروف ہے اور قومی آمدنی کا ایک فیصد حصہ اس میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اس پیمانہ پر اگر دیکھا جائے تو ترقی یافتہ ممالک اسلامی دنیا سے دس گنا زیادہ آگے ہیں۔

۳۔ وقف کے مقاصد

تجویز یہ ہے کہ اسلام کا سائنسی وقف دو مقاصد کو سامنے رکھ کر بنایا جائے ایک تو اعلیٰ معیار کے سائنس داں تیار کرنا اور دوسرے سائنسی اداروں کا قیام۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے:

(الف) وقف کی تجویز سے یہ کوشش ہوگی کہ جہاں کسی میدان میں کام کرنے والے لوگ نہ ہوں وہاں ایسے لوگ تیار کئے جائیں اور جہاں اس میدان میں کام کرنے والے ہوں وہاں ان کی حیثیت کو مستحکم کیا جائے اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے برق رفتاری سے کام کیا جائے۔

۴۔ پروگرام

اپنے مقاصد یعنی (الف) اعلیٰ سائنس کے کارکنوں کی تیاری اور ان کارکنوں کی مدد سے اسلامی سوسائٹیوں کے استحکام و ترقی کے لئے مندرجہ ذیل پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔

(الف) ۱۔ تحقیق میں جہاں جہاں ہم پیچھے ہیں اور جہاں سائنس میں رہنمائی کرنے والے افراد نہیں ہیں وہاں کے اہل علم کو وقف اپنی طرف سے ایسے کسی ادارہ میں بھیجنے کا انتظام کرے گا جہاں اس میدان میں اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کی اپنے ملک میں واپسی پر وقف ان کے کام کو جاری رکھنے میں ہر ممکن مدد

کرے گا۔ ایک کروڑ ڈالر کے سرمایہ سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے کہ چار ہزار ایسے اہل علم کی مدد کی جاسکے جو فارغ التحصیل ہو کر اپنے ملک واپس جائیں اور جنہیں اپنے کام کے لئے خاص مدد کی ضرورت ہے۔

۲۔ موجودہ ماہرین سائنس کی رہنمائی میں ایسے پروگرام بنائے جائیں جن سے اعلیٰ سطح کے سائنسدانوں کی تعداد میں اضافہ کیا جاسکے۔ مختلف یونیورسٹیوں سے معاہدہ کر کے خاص خاص مضامین میں ان کی کارگزاریوں کو مستحکم بنایا جائے۔ معاہدے ان یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی لیاقت کی بنیاد پر ہی کئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے تقریباً ڈیڑھ کروڑ ڈالر سالانہ انتظام کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی دنیا کے سائنسدانوں کا دوسرے سائنس دانوں سے رابطہ

اسلامی ممالک میں سائنس کمزور ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالمی سائنس سے بے نیاز ہو گئی۔ مسلم ممالک میں کام کرنے والے سائنس دانوں کا کوئی تعلق باہر کے سائنس دانوں سے نہیں ہے جس کی بہت بڑی وجہ ملکوں کے درمیان فاصلہ ہے۔ سائنس کے پنپنے کی شرط ہی یہ ہے کہ آپس میں تبادلۂ خیال اور تنقید کے مواقع برابر فراہم ہوتے رہیں جن ممالک میں بین الاقوامی سائنس سے تعلق نہیں رہتا وہاں سائنس دم توڑ دیتی ہے۔ وقف کی کوشش ہوگی کہ یہ صورت حال بدل جائے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ دانشور اور ماہرین فن کی آپس میں ملاقات کا انتظام کیا جائے اور کسی طویل وقفہ کے بغیر ان ملکوں میں بین الاقوامی سائنسی کانفرنسیں اور دوسرے اجلاس منعقد کئے جائیں۔ جو سرمایہ اس کے لئے ضروری ہوگا اس کا تخمینہ تقریباً پچاس لاکھ ڈالر سالانہ ہے اس سے تین ہزار سائنس دانوں کا سفر کا ایسا انتظام ہو سکتا ہے کہ وہ دو مہینوں تک باہر رہ سکیں۔ اگر اس کے دائرہ عمل میں دس سائنسی علوم ہوں اور پندرہ ممالک اس میں شریک ہوں تو اس سرمایہ سے ہر ملک سے کسی ایک سائنسی علم کے بیس افراد کے سفر کا انتظام ہو سکتا ہے۔

(ب) عملی سائنس کی تحقیقات کا انتظام

وقف ڈھائی کروڑ ڈالر سالانہ اپنے مرکزوں کے قیام اور استحکام پر خرچ کر سکتا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور دوسرے اسلامی ممالک کی ترقی سے متعلق مسائل پر تحقیق کریں یہ نئے مرکز بین الاقوامی معیار کے ہوں گے اور اس میں صحت، ٹیکنالوجی (جس میں پیٹرولیم ٹیکنالوجی بھی شامل ہے) زراعت اور پانی کی فراہمی کے مسائل پر تحقیقی کام ہوگا۔ یہ ادارے اقوام متحدہ کی یونیورسٹیوں کے نظام سے متعلق کئے جاسکتے ہیں تاکہ وہاں اسی معیار کا کام ہو سکے جو بین الاقوامی سطح پر قابل قبول ہو۔ اس قسم کے ایک کامیاب ادارے مثلاً بین الاقوامی رائس انسٹی ٹیوٹ جو فلپائن میں ہے اس کے بنانے میں تقریباً پچاس لاکھ ڈالر کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے چلانے میں بھی اتنا ہی خرچ ہوگا اگر اسے بین الاقوامی معیار پر چلایا جائے۔

(ج) اسلامی ممالک کے لوگوں کے انداز فکر میں سائنس اور ٹیکنالوجی دخیل کرنے میں وقف کو تقریباً پچاس لاکھ ڈالر کی رقم خرچ کرنا پڑے گی۔ یہ کام اطلاعات عامہ کے ذریعہ کتب خانوں، نمائش اور سائنسی عجائب خانوں کی مدد سے انجام دیا جائے گا اور اسی کے ساتھ ایجاد اور دریافت کے لئے انعام بھی دینا ہوں گے۔ عوام تب ہی سائنس اور ٹیکنالوجی سے متاثر ہوں گے جب وہ اپنی آنکھوں سے خود ان کے فائدے دیکھیں۔

(د) وقف اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین کو اس طرح بدلنے کا انتظام کرے گا کہ وہ دور حاضر کے تقاضوں پر پورے اتریں۔

۵۔ وقف کا طریقہ کار

(الف) وقف کو بنانے میں وہ تمام ممالک حصہ لے سکتے ہیں جو اسلامک کانفرنس کے ممبر ہیں۔

(ب) وقف کا صدر مقام وہیں ہوگا جہاں اسلامک کانفرنس کا۔ اپنے قائم کردہ اداروں اور اپنے چلائے ہوئے تحقیقاتی کاموں پر مسلسل نگرانی کے استحکام کے لئے وقف دفاتر قائم کر سکتا ہے اور ماہرین سائنس پر مشتمل کارندے مقرر کر سکتا ہے۔ یہ کارندے دو طرح کے ہوں گے ایک وہ جو کسی جگہ مستقل رہیں اور دوسرے وہ جو دورہ کرنے والے ہوں۔

(ج) بورڈ آف ٹرسٹیز (BOARD OF TRUSTEES) گورنمنٹ کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا جو اگر سائنس داں ہوں تو اچھا ہے۔ بورڈ وقف قائم کرنے والی حکومتوں سے رابطہ قائم رکھے گا۔ وقف کا بنیادی سرمایہ بورڈ آف ٹرسٹیز کے نام رہے گا۔

(ح) وقف کی ایک مجلس انتظامیہ ہوگی جو ممبر ممالک کے ممتاز سائنسدانوں پر مشتمل ہوگی۔ پہلی مجلس منتظمہ اور اس کے صدر کا تقرر بورڈ آف ٹرسٹیز پانچ برس کے لئے کریں گے یہ مجلس بورڈ آف ٹرسٹیز کی سائنسی پالیسی بنائے گی، اس کے اخراجات طے کرے گی اور روپیہ کے خرچ اور عام انتظامات کی ذمہ دار ہوگی۔ وقف اور اس کی مجلس انتظامیہ کے کاموں میں کوئی سیاسی مداخلت نہ ہوگی اور بورڈ آف ٹرسٹیز کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے قوانین کے ذریعہ اس عدم مداخلت کو یقینی بنائیں۔

(خ) وقف کی قانونی حیثیت ایک رجسٹری شدہ منافع نہ کمانے والے ادارہ کی ہوگی اور نہ تو اس کی آمدنی پر کوئی ٹیکس لگایا جائے گا اور نہ اس کے عملے کی تنخواہوں پر۔

(د) وقف اپنا تعلق اقوام متحدہ، یونیسکو اور اقوام متحدہ کی یونیورسٹیوں کے نظام سے قائم کرے گا اور اس میں ان کی حیثیت ایک غیر سرکاری ادارہ کی ہوگی۔

۶۔ وقف کے سرمایہ کا انتظام

(الف) یہ امید کی جاتی ہے کہ قائم کرنے والے ممالک آپس میں طے کر کے ایک ارب یعنی ایک ہزار ملین ڈالر کی رقم چار سالانہ قسطوں میں مہیا کریں گے۔

(ب) اس سرمایہ میں ممبران ممالک کا حصہ ان کی برآمدات کی آمدنیوں کا ایک جزو مقرر کیا جائے گا۔

۱۹۷۲ء کی برآمداتی آمدنیوں کی ایک فہرست ہے۔ امید ہے کہ آنے والے برسوں میں اس آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ بہرحال ۱۹۷۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق بھی ان ملکوں کی برآمدات سے سالانہ آمدنی پچیس ملین ڈالر تھی۔ اس آمدنی کا ایک فیصدی سے بھی کم حصہ اگر ہر ملک دے تو بھی چار برسوں میں ایک ملین ڈالر آسانی سے مہیا کیا جاسکتا ہے۔"

(مورخہ ۲ جولائی ۱۹۷۳ء)

یہ مختصر ۱۹۷۳ء کی اقتصادی فضا میں لکھا گیا تھا۔ اگر میں اسے آج لکھنے بیٹھوں تو میں فورڈ کے برابر ایک وقف پر ہرگز راضی نہ ہوں۔ اگر معیار پر اترنا ہے تو دنیائے اسلام کو ٹیکنالوجی اور سائنس کی تعلیم کے لئے پچاس بالکل آزاد اداروں کی ضرورت ہوگی۔ یہ ہماری ضرورت ہی نہیں ہمارا حق بھی ہے۔ یہ اس لئے کہ پچھلے بارہ برسوں میں اسلامی ممالک کی کل آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے آج یہ پانچ سو ملین ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔

ہمارے ملکوں میں پانچ بہت قد آور ہیں (سعودی عرب، ایران، ترکی، عراق اور نائیجیریا) جن میں سے ہر ایک کی سالانہ آمدنی پچاس ملین ڈالر سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ آٹھ ایسے ممالک بھی ہیں جن کی آمدنی بیس ملین ڈالر سے زیادہ ہے یہ ہیں عراق، پاکستان، ملیشیا، الجیریا، لیبیا، مصر اور عرب امارات متحدہ۔

اپنی مشترکہ ذمہ داریوں کے متعلق بس صرف یہی کہنا ہے کہ حساب کے دن ان قوموں اور افراد سے پوچھا جائے گا جنہیں کلام پاک میں مترفیہا کہا گیا ہے کہ انہوں نے اس دولت کا کیا استعمال کیا جو اس نے انہیں بخشی تھی۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ
عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا۔

(اے ہمارے رب، ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں
ان پر گرفت نہ کر۔ مالک، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے
پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔)

۸۔ ہمارے ملکوں میں ٹیکنالوجی کا حال

اور اب میں ٹیکنالوجی کی طرف آؤں گا۔ کلام پاک میں تفکر اور تسخیر پر برابر کا زور دیا گیا ہے یعنی جتنی تاکید کی گئی ہے علم کو حاصل کرنے کی اتنی ہی تاکید کی گئی ہے سائنس کے علم کی مدد سے فطرت پر قابو پانے کی۔ قرآن پاک میں ہمیں مثال دی گئی ہے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی کہ انہوں نے اپنے زمانہ کی ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا ۔۔۔۔۔ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ
أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ ۔۔۔۔۔

اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے کئی طرح کی برتری دی تھی
اور ان کے لئے ہم نے لوہے کو ملائم کر دیا تھا ۔۔۔۔۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ
وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ

اور اسی طرح ہوا کو سلیمان کا تابع کر دیا تھا ۔۔۔۔۔
اور ہم نے ان کے لئے تانبے (کو پگھلا کر اس) کا (ایک)
چشمہ بہا دیا تھا۔

یعنی میری ناچیز رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس زمانہ کی ٹیکنالوجی پر قدرت رکھتے تھے اور اسے عمارتوں تختوں اور دریاؤں پر پشتے بنانے میں استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد ہمیں ذوالقرنین کی یاد دلائی جاتی ہے جو فولادی چٹانوں اور پگھلے ہوئے پیتل سے دفاع کا انتظام کرتے تھے۔ اس طرح دھاتوں، بھاری تعمیرات، ہواؤں سے کام لینے اور ذرائع حمل و نقل کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ اور یہ بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی روایتیں بیان کی گئی ہیں ان سب کا مقصد ہدایت ہے کہ لوگ ایسی ہی باتوں پر عمل کریں اور انہیں اپنے لئے مثال سمجھیں۔

تِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔
ہم لوگوں کے لئے یہ مثالیں دیتے ہیں کہ شاید وہ غور کریں۔
سورۃ الحشر/۲۱

ہمارے نبی نے اس معاملہ میں ایک مثال قائم کر دی وہ بڑے شوق سے حفاظت کے لئے نئی ایجاد کو قبول فرماتے تھے چنانچہ دیکھئے کس طرح خندق کا عرب میں پہلی دفعہ استعمال ہوا۔ یا ان کے اس حکم کو لیجئے جو انہوں نے منجنیق (MAN-JANICS) بنانے کے لئے دیا تھا تاکہ اس سے خیبر کی تسخیر کی جاسکے عربوں کے لئے جو بالکل نئی چیز تھی لیکن قبل اس کے کہ یہ تیار کی جائے خیبر پر قبضہ ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ آخر اسلامی ملکوں کے سماج میں کون سی ایسی رکاوٹیں ہیں جو ہمیں اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی نہیں حاصل کرنے دیتیں خصوصاً وہ ٹیکنالوجی جس کی بنیاد جدید ترین سائنس پر ہے۔ عرب مسلم ملکوں میں جتنی کاوشوں اور اور جتنے سرمایہ سے ٹیکنالوجی کا استعمال گذشتہ دس برسوں میں ہوا اتنا کبھی نہیں ہوا۔ بقول زہلان کے ۱۹۷۸ء تک ان ممالک اور ان کے باہر کے مال فراہم کرنے والے تاجروں کے درمیان چار سو ملین ڈالر کے معاہدے ہو چکے تھے۔ ان میں وہ منصوبے بھی شامل تھے جن کا تعلق ہائیڈرو کاربن اور پیٹرو کیمیکلس سے ہے (۱۹۰ ملین ڈالر) تعمیرات اور مسائل نقل و حرکت (۸۰ ملین ڈالر) اور صنعتی کارخانے جن میں لوہے، فولاد، دوائیں اور کھاد بنانے والے کارخانے شامل ہیں (۴۰ ملین ڈالر)۔

بدقسمتی سے ان تمام منصوبوں کو ایسی فضا میں عملی شکل دی گئی جس میں ٹیکنالوجی سیکھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی۔ جب یہ بروئے کار لائے گئے تو اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ عرب ملکوں کے ماہرین فن اور انجینئر بھی اس میں شامل کئے جائیں اور ان ملکوں کی اس مختصر سی جماعت کی بھی کوئی نمائندگی ہو جن کا تعلق تحقیق اور ترقی سے ہے۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منصوبے الگ الگ ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ چنانچہ زہلان کی روایت کے مطابق پیٹرو کیمیکلس کے ۵۸۴ منصوبے تھے جن کی تکمیل ۱۹۷۶ء تک ہوئی ان کے بنانے میں ۸۲ بین الاقوامی کمپنیاں شامل تھیں۔ ان منصوبوں میں سولہ کا تعلق یوریا بنانے کے کارخانوں سے تھا۔ ان میں سے الجیریا کے لئے ایک، مصر کے لئے ایک، عراق کے لئے ایک، سوڈان کے لئے ایک، سیریا کے لئے ایک، متحدہ عرب امارات کے تحت ایک کارخانے شامل تھے لیکن کسی ایک عرب ملک میں بھی یہ ٹیکنیکل صلاحیت نہ جب تھی اور نہ اب ہے کہ ان کارخانوں کا نقشہ تیار کریں یا انہیں تعمیر کریں یا اب اتنے تجربہ کے بعد ان کے چلانے اور ان کو ترقی دینے کی ذمہ داری لے سکیں حد تو یہ ہے کہ عرب ممالک اس میں مل کر بھی یہ کام نہیں کر سکے۔

اس کے برخلاف جاپان کو دیکھئے جس کی آبادی عرب ممالک کی آبادی کے تقریباً برابر ہے اور جس نے پیٹرو کیمیکلس مشینوں کے میدان میں ابھی صرف بیس برس ہوئے کہ قدم رکھا ہے۔ پہلے دن سے ہی جاپانیوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ ان مشینوں کی برآمد کریں گے چنانچہ پچھلے بیس برسوں میں ہر تین میں سے ایک مشینری برآمد کر دی گئی۔ جاپانی قوم نے اس کا عزم بھی کر لیا تھا اور وہ اس قابل بھی تھے کہ ایسا کر دکھائیں۔ اگر اس کام کے جاننے والے شروع میں وہاں نہ بھی ہوتے تو ایسے لوگوں کا تیار کرنا کچھ مشکل نہیں تھا کیونکہ وہاں بنیادی سائنسوں کے جاننے والے لوگ کافی تعداد میں موجود تھے۔ اور یہ موزوں سائنس داں ایسے قابل تھے کہ وہ بہت آسانی سے ٹیکنالوجی کی تربیت دے سکتے تھے۔

جو غفلت ہم نے صدیوں سے صنعت و حرفت کی طرف کی ہے اس کا اندازہ استنبول میں مقیم برطانوی سفیر ولیم ایٹن (WILLIAM ETON) کی ایک تحریر سے لگایا جاسکتا ہے جس میں اس نے ترکی حکومت کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔

"کسی کو جہاز رانی کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہے اور نہ ہی وہ مقناطیس کا استعمال جانتے ہیں۔ سفر کرنے والوں کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی جاتی اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سفر سے روشن خیالی آتی ہے۔ اس میں کچھ دخل تو ان کے مذہبی غرور و نخوت کو ہے اور کچھ اس حسد کو بھی ہے جو غیر سرکاری کام کے غیر ملکیوں سے رابطہ قائم کرنے والوں سے ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کو ہم سائنسداں کہہ سکیں یہاں مفقود ہیں۔ اگر کوئی توپ ڈھالنے یا جہاز بنانے یا اسی قسم کے کسی اور کام کے علاوہ بھی کوئی دلچسپی رکھتا ہو تو عام طور سے لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔" اس کے بعد وہ اپنی تحریر کے خاتمہ پر ایک ایسی بات کہتا ہے جو بدقسمتی سے آج بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

"وہ ایسے لوگوں سے تجارت کرنا پسند کرتے ہیں جو ان کے لئے ایسا بیش قیمت سامان مہیا کر سکیں جسے تیار کرنے کی زحمت انہیں نہ اٹھانا پڑے"

آخر آج وہ صنعت و حرفت میں خود کفیل کیوں نہیں ہونا چاہتے؟ اس کا جواب تقریباً ہر اسلامی ملک کے لئے ایک ہی ملے گا (انڈونیشیا کی طرح کے چند ممالک کو چھوڑ کر) اور وہ یہ کہ جن لوگوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے وہ ماہرین فن نہیں ہیں۔ ہمارے ملکوں میں تو ان لوگوں کی چاندی ہے جو بیٹھ کر منصوبے بنائیں یا ملک کا بندوبست کریں۔ معاملات کا فیصلہ کرنے میں ماہرین فن کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ مثلاً پاکستان میں منصوبہ بندی کمیشن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا کوئی شعبہ ابھی تین برس پہلے تک نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ برطانوی سول سروس کی یہ روایت پاکستان جیسے ملکوں میں ابھی تک چلی آرہی ہے کہ کوئی ماہر فن یعنی ٹیکنالوجسٹ اتنا وسیع النظر نہیں ہوتا کہ وہ معاملات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر سکے۔ یہ بات بالکل نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ جاپان، چین، کوریا سویڈن اور فرانس میں ماہرین فن سائنسداں اور ملک کے منتظمین مفاہمت باہمی اشتراک، لگن اور بھروسہ کی فضا میں کام کرتے ہیں اور یہی لوگ ملکی اور صنعتی ترقی کے ذمہ دار ہیں۔

صنعت اور ایسی ٹیکنالوجی سے قطع نظر جس کی بنیاد سائنس پر ہے بہت سے اور شعبے ایسے ہیں جن کا انحصار سائنس پر ہے مثلاً زراعت، صحت عامہ، بایو ٹیکنالوجی، قوت یا انرجی کے نظام، رسل و رسائل اور دفاع۔ بدقسمتی سے ان تمام میدانوں میں ایک جیسی کیفیت ملتی ہے خصوصاً دفاع میں۔ دفاع کے لئے ساز و سامان ضرور خریدا جائے گا لیکن دفاعی سامان پیدا کرنے کی صنعت اور اس کے لئے مہارت کا نام و نشان بھی نہیں۔ انتہا ہے غفلت کی۔ کیا ہم اس خواب غفلت سے کبھی بیدار نہ ہوں گے؟ ابن خلدون (IBN KHALDUN) نے بہت زوردار الفاظ میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو چیز بعض لوگوں کو دوسروں پر ممتاز کرتی ہے وہ ان کی خوب تر کی جستجو ہے۔ جس شہر یا قوم کے لوگ خوبیوں کی جستجو کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں تب وہ ظہور میں آتا ہے جس کا وعدہ خداوند کریم نے کیا ہے اور یہی معنی ہیں قرآن کریم کی اس آیت کے:

وإذا أردنا أن نهلك قرية أمرنا مترفيها ففسقوا فيها
فحق عليها القول فدمرناها تدميرا

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے
خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں
کرنے لگتے ہیں تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا
ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

باب چہارم

حرف آخر

آخر اتنا گڑگڑا کر مجھے یہ التجا کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ لوگ سائنسی تخلیق کی طرف متوجہ ہوں، اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں جاننے کی صلاحیت پیدا کی ہے یا آج کی دنیا میں طاقت صرف علم ہی کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے یا بغیر سائنس کے کوئی مادی ترقی نہیں ہو سکتی، بلکہ بہت بڑی وجہ حقارت کے وہ تازیانے ہیں۔ جو اہل علم ہم پر برساتے رہتے ہیں، چاہے زبان سے وہ کچھ نہ کہیں۔

فرانس کے ایک نوبل انعام یافتہ عالم کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں "سلام! کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ ہمیں ایسی قوم کی خبرگیری اور مدد کرنا چاہئے یا ان کے زندہ رہنے کے لئے غذا کا انتظام کرنا چاہئے، جنھوں نے انسانی علم کو ذرہ برابر بھی آگے نہیں بڑھایا؟" اور اگر انہوں نے یہ نہ بھی کہا ہوتا تب بھی میرا سر شرم سے اس وقت جھک جاتا ہے جب میں کسی اسپتال میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہاں جان بچانے کے لئے جتنی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں چاہے وہ پین سیلین ہو یا کوئی اور دوا اس کے دریافت کرنے اور بنانے میں ہم مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے علمائے دین بھی اسی طرح سوچتے ہیں۔ اسی لئے امام غزالی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "احیاء العلوم" کے پہلے باب میں ایسی سائنسوں کی تخلیق اور ترقی پر زور دیا ہے جو اسلامی معاشرہ کے لئے ضروری ہیں مثلاً صحت عامہ کی سائنس۔ انہوں نے اس قسم کی سائنس کی تخلیق کو فرض کفایہ بتایا ہے یعنی وہ فرض جو ساری امت پر ہے لیکن اگر کچھ لوگ اسے ادا کر دیں تو ساری امت کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی ادا نہ کرے تو اس کی ذمہ داری اور گناہ ساری امت پر ہوتا ہے۔

میں آج اول تو ان لوگوں سے مخاطب ہوں جنھیں اللہ نے دولت سے مالا مال کیا ہے۔ دوسرے ان لوگوں سے جو ہمارے وزیر اور سلاطین ہیں اور جو ہماری سائنسی پالیسی کے لئے ذمہ دار ہیں اور تیسرے ہمارے علمائے دین۔

جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں سائنس اس لئے ضروری ہے کہ اس سے کائنات کے بھید کھلتے ہیں اور فطرت کے نہ بدلنے والے قوانین کا علم ہوتا ہے اور اس کی مصلحتیں بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ سائنس کے ذریعہ ہمیں مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں اور یہ ہمارے دفاع کے لئے بھی ضروری ہے اور ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ ساری دنیا کو ایک دھاگے میں پروتی ہے۔ یہ ایک ذریعہ بن سکتی ہے قوموں خصوصاً اسلامی قوموں کے آپسی تعاون کا۔ بین الاقوامی سائنس کے ہم قرضدار ہیں اور ہماری عزت نفس کا تقاضہ ہے کہ ہم اس ادھار کے چکانے کا سامان کریں۔

میں آج کل ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہوں جس کی کل آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب ہے اور جہاں کے لوگ بہت رئیس نہیں ہیں۔ یہاں ایک بینک ہے کاسا ڈی ریس پارمیو (CASSA DI RISPARMIO) اس بینک نے ۱۹۸۳ء میں پندرہ لاکھ ڈالر کا گرانقدر عطیہ انٹرنیشنل سینٹر آف تھیوریٹیکل فزکس (I.C.T.P.) کی عمارت بنانے کے تحت دیا۔ یہ سینٹر میری ہی تحریک پر بنایا گیا تھا۔ شہر کے لوگوں نے اب وعدہ کیا ہے کہ وہ یہاں کے بایو ٹیکنالوجی کے مرکز کے لئے چار کروڑ ڈالر دیں گے۔ ان کے سائنس سے اس لگاؤ اور دور اندیشی پر مجھے سخت حیرت ہے۔ کاش یہ ہمارے شہر والوں اور بینک کے مالکوں کی غیرت کو للکارے اور وہ سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ مجھے معلوم ہوا کہ امریکہ میں تیل نکالنے والے ایک قدرے گمنام خاندان کے وقف ککک فاؤنڈیشن (KEK FOUNDATION) نے سات کروڑ ڈالر کی رقم کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کو اس مقصد کے لئے دی ہے کہ وہ اس سے دنیا کی سب سے بڑی دوربین بنائیں جس کا قطر دس میٹر ہوگا۔ مجھے رشک بھی ہوا کہ یہ سب ایک ایسے شعبہ علم میں ہو رہا ہے جس میں کبھی ہمارا دخل بھی تھا یعنی ہیئت میں۔

بین الاقوامی معیار کے مطابق اپنی کل سالانہ پیداوار کا ایک فیصد اگر دنیائے اسلام میں سائنس کی تحقیق اور ترقی پر خرچ کیا جائے تو یہ رقم پانچ اور دس بلین ڈالر کے درمیان ہوگی اور ان کا ایک چوتھائی سے ایک تہائی حصہ تک بنیادی سائنس پر خرچ ہونا چاہئے۔ صدیوں قبل اس طرح کی روایات ہمارے یہاں بھی تھیں۔ آپ کو خیال ہوگا کہ گیارہویں صدی عیسوی میں امام غزالی نے عراق اور ایران کی سرزمین کو خراج تحسین دیتے ہوئے کہا تھا: "دنیا میں اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا اتنا آسان ہو۔" یہ اس وقت تھا جب وہ تارک دنیا ہو کر درویشی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ آج ہمیں یہ نہیں بلکہ کئی ایسے اوقاف کی ضرورت ہے جن کا مقصد سائنس کی ترقی ہو اور جس کا انتظام خود سائنس داں کریں۔ ہمیں بین الاقوامی اعلیٰ تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے خود ہمارے اپنے ملکوں میں اور دوسرے ملکوں میں بھی جہاں ہمارے علمائے سائنس اور ان کا علم پنپ سکے۔ کاش اب مستقبل کا کوئی گبس (GIBBS) نہ لکھے کہ پندرہویں صدی ہجری میں مسلمان سائنس داں تو موجود تھے لیکن ایسے تاجر، وزیر اور سلاطین نہیں تھے جو انہیں ان کی علمی سرگرمیوں کا سامان مہیا کرتے:

ربنا وآتنا ما وعدتنا على رسلك ولا تخزنا يوم القيامة
إنك لا تخلف الميعاد

خداوندا جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کئے
ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں
رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف
کرنے والا نہیں۔

کچھ لوگوں کو تشویش ہے کہ موجودہ سائنس کا اسلام پر کیا اثر پڑے گا۔ ان سے عرض ہے کہ سائنس کے حدود کو سمجھتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم عصر حاضر کی سائنس میں پورے طور پر شامل ہو جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم ماضی کی فلسفیانہ بحثوں ہی میں الجھے رہیں گے۔ آپ یقین مانئے کہ ہم میں اعلیٰ سائنس کی تخلیق کرنے والے موجود ہیں اور ہمارے بہت سے نوجوانوں میں اس کی صلاحیت ہے اور وہ بڑی بے تابی سے علمی جدوجہد میں حصہ لینے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ ان پر اعتماد کیجئے ان کا ایمان کسی سے کم نہیں۔ آپ اعلیٰ معیار کی سائنس کی تخلیق کے لئے انہیں سامان فراہم کیجئے۔ یہ اسلام پر ہمارا قرض ہے۔ آپ انہیں موقع دیجئے کہ وہ سائنس کے حدود کا اندازہ اندر سے کر سکیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔

آخر میں مجھے دو باتیں کہنے کی اجازت دیجئے! پہلی بات تو طلب علم کے متعلق ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں قرآن شریف کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق علم کی تخلیق اور تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے ان کے گہوارہ سے اس کی قبر تک۔ میں نے اس سلسلہ میں البیرونی کا ذکر کیا ہے جو ایک ہزار سال قبل غزنہ میں رہتے تھے۔ ان کی وفات کے متعلق ان کے ایک ہم عصر لکھتے ہیں "جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہیں تو میں ان کی آخری زیارت کے لئے ان کے گھر گیا۔ انہیں دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہیں گے۔ جب لوگوں نے انہیں میرے آنے کی اطلاع دی، تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے پوچھا کہ تم فلاں ہو میں نے کہا جی ہاں۔ انہوں نے فرمایا "میں نے سنا ہے کہ تمہیں اسلامی قانون وراثت کے پیچیدہ مسائل کا علم ہے اور اس کے بعد انہوں نے ایک مشہور مسئلہ کا ذکر کیا۔ میں نے کہا ابو ریحان۔ اس وقت اس کا کیا تذکرہ" اور ابو ریحان نے جواب دیا "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کسی بات کو جان کر مرنا اس سے بہتر ہے کہ بغیر اس کو جانے ہوئے مر جائے"۔ دل غم زدہ کے ساتھ میں نے جو کچھ مجھے معلوم تھا ان سے بیان کر دیا۔ اجازت لے کر میں نے ابھی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اندر سے آہ و بکا کی آوازیں آئیں۔ البیرونی ختم ہو چکے تھے۔

اور آخر میں اللہ کی اس کتاب کے چند کلمات دہرا کر اپنی تحریر ختم کرتا ہوں جس کتاب کے متعلق مرماڈیوک پکتھال کا کہنا ہے کہ اس کی بدولت دل مسرور اور چشم اشکبار کو کیسی کیسی نعمتیں میسر ہیں:

"چاہے ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سمندر کا پانی روشنائی ہو جائے اور سات سمندر بھی باقی رہیں اس روشنائی میں اضافہ کے لئے تب بھی تمہارے رب کی بزرگی اور فراست کے لئے الفاظ کافی نہ ہوں گے۔"

نوٹ:- اسلامی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر حبیب چٹی نے ۲۷ اپریل ۸۴ء کو اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں مسلم ممالک کے دو سکالرز کو مدعو کیا گیا۔ پاکستان کی جانب سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو موقع دیا گیا چنانچہ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ تقریر فرمائی جبکہ سعودی عرب کی طرف سے ڈاکٹر حسین الجازری سابق وزیر صحت نمائندہ تھے۔ قابل تعجب بات یہ ہے کہ پاکستان کے تمام مسلمانوں کے درمیان ایک "غیر مسلم" نے کس طرح نمائندگی کی یہ عجیب قانون ہے جو اندر کچھ اور باہر کچھ!

سائنس اور ٹیکنالوجی آپ کی ذمہ داریاں ہیں اور آپ کے سائنسدان آپ کا قیمتی سرمایہ

یونیسکو U.N.S.C.E.O انتظامیہ سے پروفیسر عبد السلام مرحوم کا تاریخی خطاب

اقوام متحدہ کی سائنس اور کلچرل آرگنائزیشن یونیسکو سے پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام مرحوم و مغفور نے ۱۹۷۵ء میں جو خطاب فرمایا اس کا مکمل متن قارئین بدر کے ازدیادِ علم کے لئے پیش ہے۔ (ادارہ)

محترم جناب چیرمین صاحب، جنرل کانفرنس کے محترم صدر اور جناب ڈائرکٹر جنرل صاحب! آپ نے مجھے اس موقع پر مدعو کیا اور انعام کے فوراً بعد اظہار خیال کا موقع دیا اور آپ دونوں حضرات نے میرے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کے لئے میں بے حد مشکور ہوں اور جتنی عزت محسوس کر رہا ہوں اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔

جناب ڈائرکٹر جنرل صاحب جب سے آپ نے اس آرگنائزیشن کی ذمہ داری سنبھالی ہے ہم اس سے باہر رہ کر بھی یونیسکو کو بین الاقوامی سائنسی نظریات کا چوراہا تصور کرتے ہیں اور یہ آرگنائزیشن ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں کے لئے گھر جیسی ہو گئی ہے۔ جس طرح سے آپ اور انتظامیہ اس آرگنائزیشن کو چلا رہے ہیں میں اس کے لئے بھی خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ یہ فنکشن جو آپ نے منعقد کیا ہے کسی نہ کسی طرح آپ کی اس تحریک کے لئے سود مند ثابت ہوگا جس کی بنیاد آپ نے ڈالی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقتوں میں ترقی پذیر ممالک کے زیادہ سے زیادہ سائنسدان اس طرح کے واقع پر اس قسم کے انعامات وصول کرنے آئیں گے۔

جناب صدر! میرا پہلا خیال اس وقت جنیوا کی یورپین ملینائی تجربہ گاہ کی طرف جاتا ہے۔ جس کے قیام میں یونیسکو نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی تجربہ گاہ CERN نے ۱۹۷۵ء میں پہلی بار نیوٹرل کرنٹ کا عملی ثبوت دیا تھا جس کے لئے آج مجھے نوازا گیا ہے۔ اس تجربہ میں استعمال کیا جانے والا گارگ میل ببل چیمبر فرانسیسی حکومت کا عطیہ تھا۔ آج میں یہاں فرانس کی میزبان حکومت کو بھی خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میرا دوسرا خیال اسٹینفورڈ لینیر ایکسلیریٹر لیبارٹری، امریکہ کی طرف جاتا ہے جہاں ان بنیادی قوتوں کی وحدت پر تجربہ کیا گیا تھا جن کا ذکر ابھی آپ نے کیا تھا اور جو ہمارے نظریہ کی ایک پیش گوئی تھی۔ امریکہ میں تحقیق کئے گئے حقائق کو بعد میں پروفیسر مارکوف کی سربراہی میں کام کرنے والے گروپ نے نووسی برسک میں مزید ثابت کیا۔ اس طرح آپ نے دیکھا کہ اگرچہ نظریاتی پس منظر ہم لوگوں نے تیار کیا تھا لیکن اس نظریہ کی عملی توثیق سائنس کی بین الاقوامی برادری کی متحدہ کوشش کا نتیجہ تھی۔

محترم ڈائرکٹر جنرل صاحب آپ نے اپنے مقالہ میں ترقی پذیر ممالک میں سائنس کی ترقی اور پختگی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انتظامیہ سے خطاب کرنے کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہوئے میں تاریخی حقائق اور تہذیبوں کے ارتقاء میں سائنس کی تاریخ کے اثرات پر اپنی رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میں ایک کہانی سے شروع کرتا ہوں

۷۵۰ سال قبل اسکاٹ لینڈ کے ایک غریب آدمی نے اپنے آبائی مقام سے جنوب کی سمت اسپین کے شہر ٹولیڈو جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام مائیکل تھا اور اس کا خواب تھا کہ وہ ٹولیڈو کی عرب یونیورسٹی میں جا کر پڑھے اور کام کرے جہاں ایک نسل قبل مشہور یہودی عالم موسیٰ بن میمون نے تعلیم دی تھی۔ مائیکل ۱۲۱۷ء میں ٹولیڈو پہنچا۔ وہاں اس نے ارسطو سے لاطینی یورپ کو روشناس کرانے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے اصل یونانی (جسے وہ نہیں جانتا تھا) کی بجائے ٹولیڈو میں مروجہ عربی کتب کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح ٹولیڈو اسکول میں عربی، یونانی، لاطینی اور ہبرو کا ایک بے نظیر آمیزہ تیار کیا جس میں ہر زبان کی دانشوری تھی۔ ٹولیڈو اور کورڈووا میں نہ صرف مشرق کے امیر ممالک یعنی شام، مصر، ایران اور افغانستان بلکہ مغرب کے غریب ممالک جیسے اسکاٹ لینڈ کے فاضل آیا کرتے تھے۔ لیکن موجودہ دور کی طرح اس وقت بھی اس عظیم بین الاقوامی سائنسی اجتماع کے راستے میں رکاوٹیں تھیں۔ مائیکل اور الفرڈ جیسی شخصیتیں منفرد تھیں۔ وہ اس وقت اپنے ملک کے کسی بھی کامیاب فلسفہ کے اسکول سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ٹولیڈو میں ان کے اساتذہ ان کی اعلیٰ سائنسی ریسرچ کی تعلیم دینے کی افادیت کے بارے میں مشکوک تھے۔ ایک استاد نے تو باقاعدہ مائیکل کو واپس جا کر بھیڑوں اور کھالوں کا کام کرنے کا مشورہ دیا۔ سائنسی تشریحات سے متعلق مزید اعداد و شمار میں مہیا کر سکتا ہوں۔ جارج سارٹن نے سائنسی تاریخ کی یادگار پانچ جلدوں میں سائنسی کارہائے نمایاں کی کہانی کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے جس میں ہر دور نصف صدی کے برابر ہے۔ ہر نصف صدی سے اس نے ایک بنیادی کردار منسلک کیا ہے۔ ۵۰۰ سے ۴۵۰ سال قبل مسیح کو سارٹن نے افلاطون (پلاٹو) کا دور کہا ہے اس کے بعد ارسطو کی نصف صدی، یوکلیڈ، آرکمیڈیز وغیرہ کی نصف صدیاں ہیں۔ لیکن پھر دور بدلتا ہے۔ ۶۰۰ سے ۶۵۰ تک ہیون سانگ کی چینی نصف صدی ہے۔ ۶۵۰ سے ۷۰۰ عیسوی تک آئی چنگ کی نصف صدی اور اس کے بعد جابر، خارزمی، رازی، مسعودی، وفا، بیرونی اور عمر خیام کی نصف صدیاں ہیں۔ ۷۵۰ء سے ۱۱۰۰ء تک کا دور مسلمانوں سے وابستہ ہے۔ ۱۱۰۰ء کے بعد مغربی نام آتے ہیں جن میں کریمونا کا گیرارڈ، جیکب اینا ٹولی، روجر بیکن وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اب بھی موسیٰ بن میمون، ابن رشد اور ابن نفیس کے نام قابل تعظیم ہیں۔ ۱۳۵۰ء کے بعد ترقی پذیر دنیا نے اپنا اثر چھوڑ دیا اور صرف چند نام قابل ذکر رہ گئے مثلاً تیمور لنگ کے پوتے الغ بیگ کی آبزرویٹری (سمرقند) اور جے پور میں مہاراجہ جے سنگھ کا کام جس نے ۱۷۲۰ء میں چاند اور سورج گرہن کے مغربی جدول میں چھ منٹ کی تصحیح کی۔ لیکن جے سنگھ کے کارنامے یورپ میں دوربین کی ایجاد کے بعد ماند پڑ گئے جیسا کہ کسی واقعہ نگار نے کہا ہے کہ مہاراجہ جے سنگھ کی چتا کے ساتھ مشرق کے تمام سائنسی علوم جل گئے۔

اب ہم رواں صدی کی طرف آتے ہیں۔ جناب ڈائرکٹر جنرل صاحب جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ وہ دور ہے جہاں مائیکل کی سائیکل کا پورا ایک دائرہ ختم ہو جاتا ہے اور اب ترقی پذیر دنیا نے مغرب سے مستفید ہونا شروع کر دیا ہے۔ یہاں میں الکندی کا قول پیش کرنا چاہوں گا یعنی "یہ ضروری ہے کہ ہم سچائی کے وسیلہ اور ذرائع کی پرواہ نہ کرتے ہوئے علم اور حقائق کو قبول کریں اور سمجھیں چاہے وہ غیر ملکی ہی کیوں نہ لائیں۔ جو حق اور سچائی کا متلاشی ہے اس کے لئے خود سچ سے بڑھ کر کسی چیز کی اہمیت نہیں۔ سچ اسے ذلیل کر سکتا ہے اور نہ شرمندہ۔" اس دور میں فزکس کی دنیا میں پہلا نام ۱۹۳۰ء میں نوبل انعام یافتہ سی۔ وی رمن کا آتا ہے۔ اس کے بعد چین کے تین ماہر طبعیات پروفیسر لی، یانگ اور ٹنگ نوبل انعام یافتگان میں آتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سال کا اقتصادیات کے لئے نوبل انعام ایک ترقی پذیر ملک کے سر آرتھر لیوس کو جا رہا ہے جس کا اعلان آج ہی کیا گیا ہے۔

وہ سوال جس کی طرف میں آپ کو لانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ کیا ہم ترقی پذیر ممالک سائنس میں اس بیداری کے راستہ پر گامزن ہیں جس پر بارہویں صدی میں مائیکل کے زمانہ میں مغربی ممالک تھے؟ یہاں یہ دیکھتے ہوئے کہ مجھے ایسی ممتاز ہستیوں کے سامنے بولنے کے مواقع کم ملتے ہیں میں قدرے صاف گوئی سے کام لوں گا۔

اس بیداری کے لئے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ پہلی تو ٹولیڈو جیسی جگہ جہاں بین الاقوامی اجتماع ہو سکے اور جہاں ایک شمع سے دوسری شمع جلائی جا سکے اور دوسری ترقی پذیر سماجوں کا یہ عہد کہ وہ حصول علم کو سب سے زیادہ فوقیت دیں گے جیسا کہ میجی انقلاب کے بعد تعلیم حاصل کرنا جاپان کے آئین میں شامل کر دیا گیا تھا۔

محترم چیرمین صاحب بدقسمتی سے جب ترقی پذیر ممالک کی طرف دیکھتا ہوں تو دونوں ضرورتوں کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ بین الاقوامی اجتماع کے مواقع کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ روایاتی یورپی ممالک مثلاً انگلینڈ اور امریکہ ترقی پذیر ممالک کے اسکالروں کو اپنے یہاں بلانے میں زیادہ سے زیادہ پابندیاں عائد کرتے جا رہے ہیں۔ اس بات کو عالمی پیمانے پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ جلد ہی ترقی پذیر ممالک کو بین الاقوامی تنظیموں یا اقوام متحدہ یا یونیسکو کی زیر نگرانی مرکز کے قیام کی ضرورت ہوگی جہاں ٹوکیو یونیورسٹی کی طرح نہ صرف ریسرچ کا کام ہو بلکہ خالص اور اطلاقی سائنسی اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام ہو۔ دوسری ضرورت ہے ترقی پذیر ممالک میں سائنسی علم کی تحصیل کا پختہ عزم جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا بھی ہم ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں میں زبردست فقدان ہے۔

آپ میں سے چند حضرات کو یاد ہوگا کہ اس سال ۵ مئی کو یونیسکو نے ایک میٹنگ کی تھی جس میں آئن سٹائن کی سالگرہ منائی گئی تھی۔ ڈائرکٹر جنرل صاحب نے اس موقع پر مجھے اظہار خیال کا اعزاز بخشا تھا۔ میں نے وہاں آئن سٹائن کے ان اقتصادی اور مالی مسائل کا ذکر کیا تھا جن کی وجہ سے فزکس اس عظیم سائنسدان کو کھو دیتی لیکن کچھ اتفاقات نے اس عظیم دولت کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ بدقسمتی سے یہ بات ترقی پذیر ممالک پر اور زیادہ سختی سے لاگو ہوتی ہے۔ شاید میں خود اپنے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اس بات کو واضح کر سکوں۔

جناب صدر یہ حقیقت کہ میں ریسرچ ماہر طبعیات بنا اور رہا چند حادثات اور اتفاقات کی مرہون منت ہے۔ پہلا اتفاق ہے دوسری عالمگیر جنگ۔ سائنس میں میری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے میرے سبھی بہی خواہوں نے مجھے باوقار انڈین سول سروس میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن شاید خدا کی مہربانی سے اس سال سول سروس کے امتحانات جنگ کی وجہ سے منسوخ کر دیئے گئے ورنہ تو آج میں پاکستان میں ایک سول سرونٹ ہوتا۔ دوسرا اتفاق جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اس قسم کا اتفاق یہاں موجود متعدد سائنسدانوں کی زندگی میں آیا ہوگا وہ یہ کہ کن حالات میں میں کیمبرج میں داخل ہوا۔ اس وقت میری ریاست پنجاب کے وزیر اعظم نے اسلحہ کی خرید کے لئے کچھ فنڈ برطانوی حکومت کے لئے جمع کئے تھے۔ جنگ جلد ہی ختم ہو گئی اور فنڈ کا پورا استعمال نہیں ہو سکا۔ وزیر اعظم نے بیرون ملک میں تعلیم کے مقصد سے کسانوں کے لئے ایک چھوٹے سے وظیفے کی بنیاد ڈالی۔ کئی وظائف کی پیشکش کی گئی۔ اسی سال ۱۹۴۶ء میں خوش قسمتی سے مجھے ایک وظیفہ مل گیا اور میں فزکس اور ریاضی پڑھنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ بدقسمتی سے آئندہ سال داخلے کا وعدہ کیا گیا۔ اسی دوران برصغیر کی تقسیم ہو گئی اور وظائف ختم ہو گئے۔ وزیر اعظم کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے کیمبرج کے سینٹ جان میں داخلہ مل گیا جہاں حال ہی میں آئن سٹائن انعام یافتہ پروفیسر ڈراک پڑھا رہے تھے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں خدا تعالیٰ کا اتنا احسان مند کیوں نہ ہوں اس نے مجھے ایک ایسے موقع پر ریسرچ کا موقع فراہم کیا جب کہ ایسا کرنا ناممکن تھا اور حالات بے حد ناساز گار تھے۔

تیسرا حادثہ جس کے ساتھ میں اپنی بات ختم کروں گا اس وقت ہوا جب میں لاہور جا کر ایک ریسرچ اسکول برائے فزکس قائم کرنے کے بارے میں کوشاں تھا۔ بدقسمتی سے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ میرا ریسرچ جاری رکھنا اور اپنے ملک میں رہنا بیک وقت دونوں ممکن نہیں تھے اپنے دل پر یہ بوجھ برداشت کرتے ہوئے میں نے جلاوطنی قبول کر لی۔ یہی بوجھ تھا جس کے زیر اثر میں نے نظریاتی فزکس میں ریسرچ کے لئے ایک بین الاقوامی مرکز کے قیام کی سفارش کی تھی اور اس بار یہ کام پاکستان اور دوسری حکومتوں کی کفالت سے ہونا تھا۔ خیال تھا کہ ترقی یافتہ ملکوں کی طرح ایک نوجوان سائنسدان ریسرچ کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ہم عمروں کے ساتھ ایک جانفزا ماحول حاصل کر سکے اور اپنی ذہنی بیٹری کو نئے خیالات سے چارج کر سکے یعنی چھٹیوں کے کچھ دن یہاں گذارے اور باقی نو ماہ اپنے وطن جا کر اپنی یونیورسٹی میں کام کرے۔ اسی بنیادی تصور کے پیش نظر ہم نے ایک بین الاقوامی مرکز کے قیام کا خیال سامنے رکھا۔

مجھے یونیسکو کے معزز انتظامیہ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس تصور کا استقبال کس طرح ہوا ہے۔ جیسا کہ ڈائرکٹر جنرل صاحب نے ابھی آپ کو یاد دلایا ہے اور جس کی بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی میں سب سے پہلے تجویز رکھی گئی تھی، یونیسکو اس تصور کا پہلے دن سے ہی حامی ہے۔ یونیسکو کے سرگرم تعاون اور حکومت اٹلی کی فراخدلانہ امداد سے ۱۹۶۴ء میں IAEA نے تریسٹے میں یہ مرکز قائم کیا جس میں ۱۹۷۵ء میں یونیسکو نے باقاعدہ مکمل پارٹنر کے طور پر شرکت کی۔ گذشتہ ۱۵ سالوں میں مرکز کی کامیابی کے ساتھ ساتھ بنیادی طبعیات کے علاوہ ایسے مضامین کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے جو خالص اور اطلاقی سائنس کے سنگم پر ہیں مثلاً میٹیریل سائنس، توانائی طبعیات، فیوزن طبعیات، ری ایکٹر شمسی و دیگر رواجی ماخذوں کی طبعیات سمندروں و ریگستانوں کی طبعیات وغیرہ۔ بنیادی مضامین میں ہائی انرجی فزکس (میرا اپنا مضمون)، کوانٹم گریوٹی، کوسمولوجی، ایٹمی اور نیوکلیر فزکس اور اپلائڈ ریاضی شامل ہیں۔ یہ تبدیلی اس لئے نہیں کی گئی کہ ہم محسوس کر رہے ہوں کہ ہم بہت زیادہ خالص فزکس میں کام کر رہے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ایسا کوئی مرکز نہیں تھا جو اس مضمون کے اطلاقی پہلوؤں پر کام کرتا ہو۔ میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں صرف ایک ہی کا نہیں بلکہ دونوں قسم کے اداروں کا قیام چاہتا ہوں تا کہ ترقی پذیر ممالک کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔

محترم چیرمین صاحب گذشتہ ۱۵ سالوں میں جب کہ میں یہ مرکز چلا رہا ہوں میں زیادہ سے زیادہ خود کو بے بس پاتا ہوں اور اس وقت پہلے سے بھی کچھ زیادہ۔ میں اس بات میں فخر محسوس کرتا تھا کہ آدھا دن ریسرچ میں اور آدھا دن انتظامی امور میں صرف کرتا ہوں لیکن گذشتہ پانچ سالوں میں یہ بتدریج تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ ایسا اس لئے نہیں کہ انتظامی کام میں اضافہ ہو گیا ہے بلکہ اس لئے کہ حالات ایسے ہیں کہ ہر وقت مرکز کی بقا کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

مختصر یہ کہ مرکز کے فنڈ میں کا نصف حصہ حکومت اٹلی دیتی ہے اور بقیہ نصف IAEA اور یونیسکو دیتے ہیں۔ یونیسکو نے ۲۵ سال قبل اس مرکز پر اپنا موقف ظاہر کر دیا تھا کہ اس کا رول اداروں کے عمل انگیز کی حیثیت سے ہے لیکن اب صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ جیسا کہ ابھی ڈائرکٹر جنرل صاحب نے فرمایا، ہر سال چار ہفتے سے لے کر ایک سال تک کے لئے تقریباً ۱۵۰۰ ماہرین طبعیات ہمارے مرکز میں آتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا خاصا تجربہ ہو گیا ہے کہ ۱۲۰ ممالک میں سائنس کی کیا کیفیت ہے۔ میرے کہنے کا مقصد مودبانہ طور پر گذارش ہے کہ اب حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ پچھلے خیال کو تبدیل کیا جائے۔ محض عمل انگیز کا کردار اب ناکافی ہے۔ ضرورت ہے کہ مزید مستحکم ادارے قائم کئے جائیں۔ یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ایسا بغیر نئے فنڈ کے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے میری مودبانہ گذارش ہے کہ یہ تنظیم ۲۵ سال قبل کئے گئے فیصلے پر نظر ثانی کرے کیونکہ کوئی دوسری تنظیم ایسی نہیں جس سے رجوع کیا جا سکے۔ ترقی پذیر ممالک کی ضرورتوں کے پیش نظر خالص اور اطلاقی سائنس کے مستحکم اداروں کا قیام عمل میں لائے۔

میں آخر میں کہنا چاہوں گا کہ دوسرے شعبوں کی طرح سائنس میں بھی دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے یعنی امیر اور غریب ممالک۔ امیر نصف دنیا یعنی صنعتی شمالی ممالک دفاعی ریسرچ پر اپنی آمدنی کا دو فیصد یعنی سو ارب ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ بقیہ نصف یعنی جنوبی غریب ممالک جن کی آمدنی امیر ممالک کا پانچواں حصہ ہے ریسرچ پر صرف دو ارب ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ چھ ہفتہ قبل وینیا کانفرنس میں غریب ممالک نے عالمی فنڈ سے دو ارب کو چار ارب تک کرنے کی درخواست کی تھی۔ ہم سے اس کے ساتویں حصہ کا وعدہ کیا گیا۔ اس کے پیش نظر یونیسکو کے پروگرام جن میں مذکورہ نظریاتی طبعیات کا بین الاقوامی مرکز بھی شامل ہے نقصان میں رہیں گے

میں تین گذارشات کے ساتھ ختم کروں گا۔ پہلی اور سب سے اہم ترقی پذیر ممالک کے نمائندوں سے ہے جن میں میں بھی شامل ہوں۔ میں ایک ذاتی اپیل کر رہا ہوں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی آپ کی ذمہ داریاں ہیں اور آپ کے سائنس داں آپ کا قیمتی سرمایہ۔ انہیں نوازیئے۔ انہیں ملک کے سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ارتقاء میں شامل ہونے کے مواقع فراہم کیجئے۔ انہیں اکیلا مت چھوڑیئے۔ دو ارب کی رقم کو بیس ارب تک پہنچانے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں بین الاقوامی برادری سے اپیل کروں گا کہ ایسی دنیا جو سائنسی میدان میں اتنی بٹی ہوئی ہو زیادہ پائدار نہیں ہو سکتی۔ کوئی یہ سوچے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس جیسے بین الاقوامی مرکز کا کل بجٹ صرف پندرہ لاکھ ڈالر ہے جسے سو ترقی پذیر ممالک پر خرچ ہونا ہے جب کہ سرن کی تجربہ گاہ جس میں میں نے کام کیا ہے اور جسے میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، کا بجٹ ایک ارب ڈالر کا تہائی ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس پر سائنسی ریسرچ ہونی چاہئے تا کہ وہ موثر ہو سکے اور یونیسکو کی اس جلیل القدر انتظامیہ کو اگر ممکن ہو تو ساری دنیا کے لئے ضروری فنڈ اکٹھا کرنے کے ذرائع پر غور کرنا چاہئے۔

اور آخر میں اپنے اسلامی ممالک کے بھائیوں سے اپیل کروں گا۔ میں نے اسلامی سائنس کا ذکر کیا ہے۔ میں نے یہ بات عمداً کہی ہے۔ آپ میں سے کچھ کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ ارب ڈالر سے زیادہ آمدنی عطا کی ہے۔ بین الاقوامی معیار کے مطابق ان ممالک کو تقریباً ایک ارب ڈالر سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کرنا چاہئے۔ آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں صدی میں ان کے آباء و اجداد سائنس اور ٹیکنالوجی کی شمع کو روشن رکھنے والے تھے۔ انہیں کے آباء و اجداد نے بغداد اور قاہرہ میں سائنس کی اکادمیاں شروع کیں۔ ایک بار پھر سخاوت کا مظاہرہ کیجئے۔ عالمی سائنس پر ایک ارب ڈالر خرچ کیجئے چاہے دوسرے کریں یا نہ کریں۔ ایک ٹیلنٹ فنڈ قائم کیجئے۔ آخری فرق قابلیت سے ہی پڑتا ہے۔ اس قابلیت (ٹیلنٹ) فنڈ سے استفادہ صرف اسلامی اور عرب ممالک تک محدود نہ رکھ کر سبھی ترقی پذیر ممالک کے لئے عام کیجئے۔ اس فنڈ میں میری ذاتی حقیر امداد ساٹھ ہزار ڈالر کی ہوگی جو ۱۰ دسمبر کو سویڈش اکاڈمی بطور انعام مجھے دے رہی ہے۔[1]

شکریہ

[1] پروفیسر سلام نے اس رقم کی مدد سے ترقی پذیر ممالک کے نوجوان سائنسدانوں کا خاص طور پر پاکستانیوں کی مدد کی مدد کے لئے ایک فاؤنڈیشن قائم کی۔

(بقیہ صفحہ ۶)

جماعت احمدیہ کا تعلیمی منصوبہ ڈاکٹر عبد السلام کے ذریعے عالم اسلام کو سائنس کا گمشدہ ورثہ واپس ملنے کا آغاز ہوا ہے لیکن اسلام کی عظمت کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے ان جیسے مسلمان سائنسدانوں کا کثرت سے پیدا ہوتے رہنا ضروری ہے لیکن اس ضرورت کا احساس صرف جماعت احمدیہ کو ہے اور اللہ تعالیٰ جماعت احمدیہ کے ذریعے یہ انقلاب لانا چاہتا ہے۔

چنانچہ جلسہ سالانہ ۱۹۷۹ء کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ڈاکٹر سلام کی نوبل انعام لینے پر تعریف کی اور ان کے نقش قدم پر چل کر احمدی بچوں کو کثرت سے چوٹی کے سائنسدان بننے کی تلقین فرمائی۔

حضور نے فرمایا کہ قیام احمدیت کی آئندہ صدی میں جو کہ غلبہ اسلام کی صدی ہے جماعت کو ایک ہزار چوٹی کے سائنسدان اور محقق چاہئیں یہ صدی ۱۹۸۹ء سے شروع ہو رہی ہے اور اس دوران ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء تک کے دس سالوں میں سو چوٹی کے سائنسدان اور محقق چاہئیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حضور نے تعلیمی منصوبہ بندی کا اعلان کیا اور فرمایا:-

"آج میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ جماعت احمدیہ ہر ذہین مگر غریب بچے کو پرائمری سے سنبھالے گی...... جماعت کا کوئی ذہین بچہ چاہے وہ ماسکو میں ہو یا نیویارک میں یا پاکستان کے اندر یا باہر اس کا ذہن ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا نوع انسانی کے اس ذہن کو سنبھالنا ہے یہ اسلام نے بتایا ہے اور اسلام کے اس حکم کو قائم کرنا ہے...... ہم ہر سال جماعت احمدیہ کی طرف سے سوا لاکھ روپے کے وظیفے ذہین طلباء کو دیں گے...... یہ انعام نہیں یہ ان طالبعلموں کا حق ہے...... جماعت احمدیہ اپنی طرف سے ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی یہ عزت افزائی کرتی ہے کہ ان کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کرتی ہے...... میری دعا ہے کہ یہ سکیم جماعت اور قوم کے لئے انتہائی مفید ثابت ہو۔"[1]

تیسری دنیا کے لئے خدمات تیسری دنیا سے مراد غریب اور غیر ترقی یافتہ ممالک ہیں جن کے لئے ڈاکٹر سلام کی بے شمار خدمات میں سے بعض یہ ہیں:-

- تیسری دنیا کے ممالک میں سائنس کی ترقی کی کوشش۔
- اٹلی میں طبیعات کی تعلیم و تربیت کے لئے عالمی مرکز کا قیام۔
- دنیا میں دولت کی غیر مساوی تقسیم روکنے کے لئے سائنسی مجالس میں تیسری دنیا کی نمائندگی۔
- ایٹم برائے امن کے لئے جدوجہد۔
- ترقی پذیر ممالک کے دورے اور حکومتوں کو اہم مشورے۔

ڈاکٹر عبد السلام کی پاکستان، اسلامی ممالک اور تیسری دنیا کے لئے خدمات کے اعتراف میں ان ممالک کی ایک درجن سے زائد یونیورسٹیوں نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دی ہیں اور کئی موقعوں پر اس کا اعتراف کیا ہے۔

[1] بحوالہ الفضل ۳ جنوری ۱۹۸۰ء

ترقی پذیر ممالک کے لئے ایک غمگسار دل ڈاکٹر عبدالسلام

پروفیسر عبد السلام مرحوم و مغفور نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے مخصوص اجلاس سے خطاب کے بعد اسٹاک ہوم یونیورسٹی میں ۲۳ ستمبر ۱۹۷۵ء کو جو تاریخی لیکچر دیا وہ ذیل میں کتاب "خواب اور حقیقت" کے شکریہ کے ساتھ پیش ہے۔ (ادارہ)

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اس مخصوص اور اہم اجلاس کے اختتام کے فوراً بعد نوع انسان کے عالمی مسائل پر اس سلسلے کا اولین لیکچر دینے کے لئے مدعو کئے جانے پر مجھے فخر بھی ہے اور میں اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کرتا ہوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں یہ اجلاس انسانوں کے درمیان موجود بحران اور امیر و غریب کی تقسیم اور غرباء کی نئے بین الاقوامی معاشی نظام کی مانگ پر بحث کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ میں اس موقعے کے لئے چشم براہ تھا کہ آپ سے کچھ عرض کر سکوں کیونکہ سویڈن ان ممالک میں سے ایک ہے جنھوں نے اصل مدعا سمجھ لیا ہے۔ فی الحال یہ وہ ملک ہے جس نے اقوام متحدہ کے امدادی نصب العین کو پورا کیا ہے۔ دوسری بات عالمی معاملات کا تعلق ہے اس کے نوجوانوں نے ۱۹۷۲ء میں دنیا کی رہنمائی کی تھی۔ میری آپ سے بات چیت کا مقصد یہ ہے کہ ان طریقوں کا انکشاف کر سکوں جن سے متمول اقوام میں اس سلسلے میں پائی جانے والی نافہمی کو غریب اقوام کے حق میں ختم ہو سکے اور جس بحرانی کیفیت سے انسانیت دو چار ہے انسانی جانب ترقی یافتہ معاشرے کی توجہ جلد از جلد دلائی جا سکے۔

یہ بحران جس سے عالم گذر رہا ہے بس اتنا ہے کہ ترقی پذیر جو کہ پوری انسانی آبادی کا ۱/۴ ہے دیوالیہ ہو چکا ہے۔ ہم جو غریب ہیں وہ امراء کے تقریباً پچاس بلین ڈالر کے مقروض ہیں جو کہ عالم انسانیت کا ۱/۴ ہیں۔ ہم میں سے جو سب سے غریب ہیں وہ تو ہمارے ان قرضوں کا سود بھی ادا نہیں کر سکتے۔ اس سے کہیں کم ہیں وہ دس بلین ڈالر جن کی ہم کو متعدد طور پر دس ملین ٹن غلہ اپنی سالانہ خوراک کے لئے منگانے میں ضرورت پڑتی ہے۔ میرا اپنا ملک پاکستان ہی تقریباً چھ بلین ڈالر کا مقروض ہوتا ہے جو کہ پاکستان کی سالانہ جی۔ این۔ پی کے برابر ہے اور تقریباً پاکستان کی چھ سال میں برآمد شدہ مال سے ہونے والی آمدنی کے برابر ہے۔ پچھلے ہفتے لندن کے معاشیاتی جریدے میں قطعی طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ "غریبوں میں جو سب سے زیادہ غریب ہیں جو نہ تو مزید قرض لے سکتے ہیں اور نہ اپنی محفوظ اشیاء پر ہی گذارا کر سکتے ہیں، وہ اپنی درآمدوں کو ختم کر لیں گے اور بھوکے مر جائیں گے۔"

لیکن یہ قلیل مدتی بحران طویل بحران کا ہی حصہ ہے۔ اخراجات اور آمدنی کے اعتبار سے ہماری دنیا بے پناہ غیر متوازن ہو چکی ہے۔ دنیا کی تین چوتھائی آمدنی، تین چوتھائی لاگت، اس کی خدمات اور تقریباً دنیا کی تمام ریسرچ صرف ایک چوتھائی لوگوں کے قبضے میں ہے۔ وہ تنہا اس کے ۷۸ فی صد معدنیات اور اتنے اسلحہ جتنے باقی تین چوتھائی دنیا مل کر استعمال کرتی ہے، استعمال کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں دنیا کے امیر ترین ایک بلین نے تین ہزار ڈالر فی آدمی کمائے جبکہ دنیا کا غریب ترین ایک بلین سو ڈالر فی کس سے زائد نہیں کما سکا۔ اور سب سے خوفناک پہلو تو اس کا یہ ہے کہ اس معاملے میں قطعی کوئی بصیرت نہیں ہے اس کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا جس سے اس قدر زیادہ فرق کو دور کیا جا سکے۔ روایتی انداز میں کی جانے والی ترقی سے ۱۹۸۰ء تک بازاری کفایت سے صرف سو ڈالر فی کس کو ۱۰۲ ڈالر فی کس کیا جا سکتا ہے جبکہ امیروں کے ۳۰۰۰ ڈالر فی کس بڑھ کر چار ہزار ڈالر فی کس بن جائیں گے یعنی ایک ہزار ڈالر کے مقابلے میں تین ڈالر کی ترقی ہو گی پورے دس برس میں۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے اگر غریب اقوام اس روایتی معاشی نظام کی بنیاد پر ہونے والی اس ترقی کو ایک بہت بڑا فریب تصور کرتی ہیں۔ یہ وہ نظام ہے جس نے بیس سال کی طویل مدت میں ۱۲۰ بلین ڈالر کی زری اور ساکھ میں سے غریب اقوام کے لئے صرف اس کا پانچ فیصدی مقرر کیا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو کہ عالمی سامان کے لئے دو سو ڈالر ادا کرنے کے بعد اس کے خالق کو صرف اس کا ۱/۵ حصہ دیتا ہے اور باقی ۴/۵ تقسیم کنندگان اور درمیانی متمول ممالک کو چلا جاتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس نے پچھلے سال سات بلین ڈالر کی امداد دے کر غریب ممالک سے ان کی اشیاء کی قیمتیں گرا کر ٹھیک اتنا ہی واپس لے لیا۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر وہ عمر خیام کے لفظوں میں یہ بینگ کر رہے ہیں کہ "اے محبت کاش میں اور تو مل کر نصیب کے خلاف سازش کر اس پورے تکلیف دہ نظام کو بدل ڈالتے۔ کاش ہم اس کو پاش پاش کر کے نئے سرے سے اپنی مرضی کے مطابق نظام تیار کر سکتے ہیں۔"

پچھلے تین چار سالوں سے دنیا کی معاشیات میں کچھ مشہور شخصیات کی مدد سے ہماری تیسری دنیا کے ممالک برازیل، میکسیکو، الجیریا اور پاکستان وغیرہ کے ہونہار معاشیاتی ماہرین ترقی اور برصت کی کسی نئی ترکیب کے سلسلے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ میں اپنے پیشے سے شرمندہ ہوں کہ وہاں ایسے سائنس دان یا ماہر ٹیکنالوجی نہیں تھے جو ان کی مدد کرتے۔ یہ وہی نئی ترکیب ہے جو کوکویاک اور ریو اعلانیہ سے منسوب ہے اور جس نے ۱۹۷۴ء کے اقوام متحدہ اسمبلی کے چھٹے مخصوص اجلاس میں کئے گئے نئے بین الاقوامی معاشیاتی حکم نامے میں کئے گئے اعلان کی قرار داد کی بنیادیں تعمیر کی ہیں۔ موجودہ اجلاس جو ابھی ختم ہوا ہے پچھلے ارادے پر مستعدی سے جمے رہنے کا اظہار تھا۔ ۱۹۷۴ء میں یو۔ این۔ او کے نافذ کردہ معاشی حقوق کے فرمان کو ذہانت عطا کرنے کے لئے یہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔

ٹام پین نے اٹھارہویں صدی میں غرباء کے درمیان ان اعلانات کو آدمی کے حقوق کے عظیم اعلانات سے منسلک کر دیا تھا اور انیسویں صدی کے منشور اشتراکیت نے بھی نہیں کیا۔ متمول ممالک میں بین الاقوامی معاشی فرمان کے بارے کیا سوچا جاتا ہے اس کی تھاہ پانا امر محال ہے۔ ۱۹۷۴ء کے دوران اس کا رد عمل اقوام متحدہ میں ایک متمول قوم کے نمائندے کے الفاظ میں مثالی علامت بن چکا ہے جس نے اسے بہت سی قلیل مدتی اور مبہم سی قرار دادوں کے سلسلے کی خامیوں سے تعبیر کیا ہے جس میں ہر قرار داد اپنی پچھلی قرار داد سے طویل تھی۔۔۔" اس سال اگرچہ جواب تمام تر اقرار تو نہیں تھا پھر بھی ڈاکٹر کسنجر نے متمول اقوام کی جانب سے اسمبلی کے روبرو باہمی امدادی فنڈ، مشترکہ ادارے اور اعانت کے آغاز جیسے روپہلے وعدوں کا گچھا پھینکا تو ہے۔ میں ان کی بعد میں بات کروں گا۔ لیکن بہرحال اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی وزارت خارجہ اور وزارت خزانہ غریب ممالک کی ضروریات کا مناسب جواب دیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ذہین افراد اور عوام بھی ان تمام باتوں کو ٹھیک طور پر سمجھ لیں۔

اس جذبے کے ساتھ میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ ایک ترقی پذیر ملک کا نرم گفتار سائنس دان جو معاشیات کا ماہر نہیں ہے لیکن جذباتی طور پر اقوام متحدہ اور اس کے کارناموں کو عزیز رکھتا ہے، عالمی بحران اور غریب و امیر اقوام کے درمیانی فرق کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

غریب ممالک کے عقب کے نفسیاتی راز کی تہہ میں پہنچنے کے لئے یہ بات سمجھنی ہوگی کہ غریب و امیر کے درمیان یہ فرق کس قدر جدید ہے۔ یاد کیجئے کہ ابھی تین سو سال پیشتر ۱۶۶۰ء کے آس پاس جدید تہذیب کی نمائندہ دو اہم یادگاریں، مغرب کی لندن میں سینٹ پال چرچ اور مشرق کی آگرے میں تاج محل تعمیر ہوئی تھیں۔ یہ دونوں فن تعمیر کی تکنیک، تقابلی دستکاری کا معیار اور تقابلی امارت کا معیار اور نزاکتی تصنع جو دونوں تہذیب و تمدن میں تاریخ کے اس دور میں تھی، اتنی اچھی طرح دونوں زبانیں بیان کرتی ہیں کہ اس کو انسانی الفاظ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

لیکن تقریباً اسی دور میں صرف مغرب میں ایک تیسری یادگار قائم ہوئی جو انسانیت کے لئے شدید دور آمد کے شعور پر اور بھی عظیم تھی اور یہ نیوٹن کے اصول تھے جو ۱۶۸۷ء میں شائع ہوئے تھے۔ نیوٹن کے اس کارنامے کا مغلیہ ہندوستان میں کوئی ثانی نہیں تھا۔ میں اس ٹیکنالوجی کا جس سے تاج محل تعمیر ہوا تھا وہ حال بتانا چاہوں گا جو اس وقت ہوا جب وہ نیوٹن کے اصولوں سے تاویل کردہ تکنیک اور تہذیب سے ہمکنار ہوئی۔

اس کا نتیجہ تقریباً ۱۷۵۷ء میں ظاہر ہوا۔ تاج محل کی تعمیر کے تقریباً سو برس بعد شاہ جہاں کے جانشین کو کلائیو کی مختصر فوج کے بہترین آتشیں اسلحہ کی قوت نے ذلت آمیز شکست دی۔ سو برس بعد ہی ۱۸۵۷ء میں آخری مغل تاجدار کو ملکہ وکٹوریہ کے حق میں دہلی کی سلطنت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے ساتھ نہ صرف یہ کہ ایک سلطنت ختم ہو گئی بلکہ ٹیکنالوجی اور تہذیب و تمدن کی ایک مکمل روایت دفن ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء تک ہی انگریزی نے فارسی کی جگہ لے لی۔

مدارس کے نصاب میں غالب اور عمر خیام کے محبت کے نغمات کی جگہ شیکسپیئر اور ملٹن کو دے دی گئی۔ اور سینہ کی ادویات کو فراموش کر دیا گیا، ڈھاکہ کی ململ کے فن کو تباہ کر کے لنکاشائر کے کاٹن پرنٹ کے لئے راہ ہموار کر دی گئی۔

ہندوستان کی تاریخ کے آئندہ سو سال اور بھی زیادہ چالاکی کے ساتھ فیاضانہ ناجائز انتفاع کی مکمل سرگزشت پیش کرتے ہیں۔ میں اس سب کی بات نہ کر کے صرف اس تکنیکی اور سائنسی ماحول کا ذکر کروں گا جس میں برطانوی دور کے ہندوستان میں میری پرورش ہوئی۔ آج جو حصہ پاکستان ہے اس میں برطانیہ حکومت نے ۲۱ لبرل ہائی اسکول و آرٹ کالج کھولے لیکن چار کروڑ لوگوں کی آبادی میں صرف ایک انجینئرنگ کالج اور ایک زرعی تعلیمی کالج کھولا گیا۔ اس پالیسی کے نتائج کا اندازہ پہلے سے ہی لگایا جا سکتا تھا۔ فرٹیلائزرس اور پیسٹی سائڈز کے کیمیائی انقلاب نے ہمیں چھوا تک نہیں۔ فن مصنوعات مکمل تغافل کا شکار ہو گئے۔ ایک لوہے کے ہل کے لئے کبھی ہم انگلینڈ کے محتاج تھے۔ اسے انگلینڈ سے ہی منگانا پڑتا تھا۔ اس ماحول کے اندر تقریباً ۲۵ برس پہلے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں، میں نے جدید طبعیات کی معلمی شروع کی تھی۔

پاکستان نے سو برسوں کی غلامی کے بعد ان ہی دنوں میں آزادی حاصل کی تھی۔ اس وقت ہماری فی کس سالانہ آمدنی اسی ڈالر تھی، خواندگی تیس فی صدی تھی، آبادی میں ترقی کی رفتار تین فی صدی تھی اور زراعت کے لئے آبپاشی کا نظام ختم سا ہو رہا تھا۔ کوئی معاشرتی تحفظ نہ تھا۔ بچوں کی اموات کی شرح بہت زیادہ تھی۔ اولاد نرینہ جو کہ بڑھاپے میں تحفظ کا واحد سہارا تھی اسی کے سبب اونچی شرح پیدائش کو لازمی بنانے کی گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔

پاکستان نے بڑی خوشی سے آزاد عالمی معاشی گروہ کا حصہ بننا تسلیم کر لیا۔ ہمیں بڑھتی ہوئی آبادی اور مزید غلہ پیدا کرنے کی ضرورتوں کی فکر سے چھٹکارا مل گیا۔ شروع میں پی۔ ایل ۴۸۰ کے تحت امریکہ سے اضافی گیہوں اس قدر وافر مقدار میں آیا کہ ہماری وزارت خزانہ کے ایک رکن نے پاکستان میں گیہوں کی پیداوار کم کر کے تمباکو پیدا کرنے کو قانونی شکل دینے کی بات رکھی۔ ہم نے ہارورڈ یونیورسٹی سے بڑے اور ذہین لوگوں کو بلایا جو ترقیاتی منصوبہ بندی میں معاون ہو سکیں۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہمیں اسٹیل کی انڈسٹری قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس سلسلے میں کتنی بھی خریداری پٹس برگ سے کر سکتے تھے۔ ہم نے اپنی تیل کی درآمدوں کو پٹے پر دے دیا اور اندرون ملک پیٹرولیم مصنوعات کی تقسیم بھی کثیر اقوام کے سپرد کر دی جنھوں نے اس تیل کی خفاظت کے دور میں بھی بڑی بے دلی سے اس کی جستجو کی۔

اس طرح پاکستانی بعد از نوآبادیاتی معاش کی مستند مثال بن گیا۔ سیاسی سرپرستی معاشی سرپرستی میں بدل گئی۔ اشیاء کے معاملات میں ہمیں جوٹ، کپاس، چائے اور خام چیزیں مہیا کرنا پڑتا تھا۔ اشیاء کی قیمتوں کا ایک واقعہ جو ۱۹۵۶ء میں سنا تھا مجھے یاد ہے کہ ان تمام اشیاء کی قیمتیں مستقل گر گئیں جنھیں ہم بناتے تھے اور وہ صنعتی سامان جسے ہم باہر سے منگاتے تھے اس کی قیمتیں اتنی ہی چڑھتی گئیں اور یہ سب ان پالیسیوں کے نتیجے میں تھا جو مفاد دائمہ اور تحفظ کے لئے اپنے معاشرے میں بنائی گئی تھیں۔ یہ سب مارکیٹ اکنامکس کہلاتی تھی۔ اور جب ہم نے صنعتی کارخانے بنا لئے تو ہماری راہ میں زبردست درآمدی محصول رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ ہماری سستی محنتوں کے باوجود بھی ہم پر ناجائز حرکات کے الزامات عائد کئے گئے۔

آپ کو ان محصولوں کا اندازہ کرانے کے لئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں فرض کیجئے گا کہ پاکستان نے کپاس کے بیج برآمد کئے تو وہ محصول کے طور پر صرف سو ڈالر فی ٹن لاتے تھے لیکن اگر یہ نہ کر پاتے اور اگر بیج کا تیل نکال لیا گیا تو تیل صنعتی درجے میں آ گیا اور محصول چھ سو ڈالر تک گیا۔ ہمیں اسٹیل، مشینوں، فرٹیلائزرس اور اسلحہ کے لئے بازار بنانے تھے۔ ہمیں وہ چیزیں برآمد نہیں کرنی چاہئیں جو ذرا بھی صنعت کے اعتبار سے فیض بخش ہوں ایسا کرنے کوئی تعجب نہیں کہ ہم دیوالیہ ہو جاتے۔

نئی سائنس اور ٹیکنالوجی یا کسی تکنیکی افرادی قوت کی ترقی کے لحاظ سے نہ تو اس کی کوئی ضرورت تھی نہ اس کے لئے کوئی پسندیدگی کا اظہار تھا اور نہ ہی اس کے لئے کوئی گنجائش تھی۔ اور اس طرح یہ ہر طرف سے پابندیوں سے مسدود تھی، بجھی ہوئی تھی۔ مثلاً کوئی بھی ایسی مصنوعات جن میں اس ٹیکنالوجی کا ہاتھ ہو برآمد نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور کسی بھی حالت میں مکمل ٹیکنالوجی بک نہیں سکتی تھی۔ مثلاً ۱۹۵۵ء میں پاکستان پین سلین بنانے کی صنعت نہیں خرید سکا۔ میرے بھائی نے کچھ دو ماہرین کیمیا کے ساتھ مل کر نیا طریقہ نکالا اور اپنی ناتجربہ کاری کے سبب پین سلین کو دنیا میں اس کی قیمت سے ۱۶ گنی لاگت میں بنایا۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں پاکستانی ترقی اور ٹیکنالوجی جو ان دنوں ناپید تھی، کو بڑھانے کے لئے میں نے اپنے مستقبل کو داؤ پر لگانے کی بات سوچی۔ میں اپنے ملک کی مدد صرف ایک طرح سے کر سکتا تھا اور وہ تھی بحیثیت ایک معلم کے۔ اور اس کا مقصد تھا مزید ماہرین طبعیات پیدا کرنا جو صنعت کی قلت کے سبب یا تو معلم ہی بن جاتے یا پھر اپنا ملک چھوڑ دیتے۔

لیکن مجھے بہت جلد اس کا احساس ہو گیا کہ بحیثیت ایک معلم کے میرا کردار میرے لئے ناممکن بن جائے گا۔ لاہور کے اس علیحدگی کے ماحول میں جہاں نہ اچھا ادبی یا علمی ذخیرہ تھا، نہ دوسرے ماہرین طبعیات تھے جن سے رابطہ بڑھایا جاتا، نہ بین الاقوامی رابطوں کی کوئی صورت تھی، میں بالکل غیر موزوں تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں تنہا سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کا احساس کرانے کے لئے پاکستانی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا تھا۔ کسی کی پیشہ وارانہ اہلیت کو برقرار رکھنے کا ایک ہی وسیلہ تھا کہ بین الاقوامی سائنس اقوام کی توجہ اس طرف ملتفت کی جائے۔ میری امیدیں اقوام متحدہ کی تنظیم سے وابستہ تھیں اور اس طرح ۱۹۵۴ء میں ان سب کے ساتھ میں نے یہ تحریک شروع کی۔

گزشتہ بیس سالوں سے میں بڑے نرم رویئے کے ساتھ سائنس اور بین الاقوامی امور سے وابستہ ہوں۔ میں اس مدت کو دو مختلف دس سالہ عرصوں میں منقسم کر سکتا ہوں۔ پہلا ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۴ء تک کا عرصہ جو کہ لاعلمی اور امیدوں کا دور تھا، دوسرا ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۴ء تک جو کہ یاسیت اور ناامیدیوں کے پہنچنے سے متعلق تھا۔ میرے لئے اب تیسرا دس سالہ عرصہ شروع ہو رہا ہے۔ شاید یہ عرصہ مزید امیدیں لے کر آئے گا۔

اپنی کہانی کی طرف واپس لوٹتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ امور عالم سے متعلق اپنا کردار ادا کرنے کا پہلا موقعہ مجھے ۱۹۵۵ء میں اس وقت میسر ہوا جب جنیوا میں ایٹم فار پیس کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں مشرق و مغرب کے اس معمولی سے درمیانی پردے کو اٹھایا گیا تھا جس کے پس پشت نیوٹرون اسکیٹرنگ سے متعلق کچھ اطلاعات چھپی ہوئی تھیں۔ اسی کانفرنس میں ایٹمی بہتات کو عالمی توانائی، آئیسوٹوپک اور فصلوں کی انقلاب انگیز تولیدی اقسام کے لئے استعمال کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

ذاتی طور پر میرے لئے یہ کانفرنس اس لحاظ سے بھی اہم تھی کہ میں پہلی مرتبہ اقوام متحدہ سے متعارف ہوا تھا۔ مجھے اس مقدس عمارت میں اپنا داخلہ آج بھی یاد ہے جب میں نیویارک میں بنی اس شاندار عمارت میں ۱۹۵۵ء میں داخل ہوتے وقت وہاں کے ان سحر میں گرفتار ہو گیا تھا جو اس تنظیم نے پیش کئے تھے مثلاً وہاں کے افراد، وہاں کے ہنگامے اور مختلف النوع قسم کی اشیاء اور افراد جو بہبودی اور امن کے قیام کی خاطر اس تنظیم نے یکجا کئے تھے۔ مجھے اس وقت پتہ نہیں تھا کہ یہ تنظیم کس قدر نازک، کتنی کمزور ہے اور اپنی بے عملی میں کس قدر مایوس ہے لیکن میں اس کی بات بعد میں کروں گا۔ اس وقت مجھ کو ایسا لگا کہ ترقی پذیر ممالک اور پاکستان کی طبعیات کی ترقی کے لئے جو بھی نظریہ اپناؤں اس پر اقوام متحدہ کے توسط سے عمل درآمد ہونا چاہئے۔

دوسری مرتبہ ۱۹۵۸ء میں دوسری ایٹم فار پیس کانفرنس کے موقعہ پر میرا اس تنظیم سے سابقہ پڑا۔ یہ کانفرنس بھی ۱۹۵۵ء ہی کی مانند تھی۔ نیوکلیائی فیوژن کی عدم ترتیب کا طریقہ اس کی بڑی کامیابی تھی۔ میری سب سے عظیم کامیابی یہ تھی کہ مجھے بین الاقوامی امور کے ڈاکٹر سگوارڈ اکلنڈ جو کہ بین الاقوامی انرجی ایجنسی کے ڈائرکٹر جنرل ہیں ان کی سرکردگی میں سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس دن سے ہمارے درمیان بڑے خوشگوار تعلقات اور دوستی پیدا ہو گئی جس نے میری زندگی کے دھارے کو بدل دیا۔

۱۹۵۸ء کی کانفرنس کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ پاکستان کی حکومت ایٹمی انرجی میں دلچسپی لینے لگی۔ پاکستان کے پاس تیل کے ذخائر نہیں ہیں، تھوڑی سی گیس اور کچھ آبی قوت توانائی ہے۔ پاکستان کو ایٹمی طاقت کی ضرورت تھی۔ ۱۹۵۸ء میں جب صدر ایوب خاں اقتدار میں آئے تو مجھے ایٹمی انرجی کمیشن کے قیام میں مدد دینے کی خاطر پاکستان بلایا گیا۔

ہم نے یہ طے کیا کہ ملک میں کسی اور سائنسی ادارے کی عدم موجودگی میں یہ ہمارا فرض ہے کہ تمام ملک میں ایٹمی صنعت کے ساتھ ساتھ دیگر قومی جد و جہد کے پیمانے پر مثلاً زرعی، صحت وغیرہ کے میدان میں تحقیقی ادارے اور تحقیقی ٹیم بنائی جائیں۔ اس مقصد کے لئے اور پاکستانی یونیورسٹیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں دنیا کے بڑے بڑے اداروں میں ریاضی داں، ماہرین کیمیات، ماہرین طبعیات، ماہرین زراعت کو تربیت دلانی چاہئے۔

سائنسی افرادی طاقت کی تربیت کے لئے ہم نے اپنے ناکافی وسائل و ذرائع کے حدود میں رہ کر ایک پروگرام مرتب کیا۔ میں ناکافی وسائل اس لئے کہہ رہا ہوں کیونکہ تمام یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں ہونے والے مصارف چار ملین ڈالر سے کبھی نہیں بڑھے جو اتنی رقم ہے جتنی آپ سویڈن میں تنہا شعبۂ طبعیات پر صرف کرتے ہیں۔ ان ناکافی وسائل کے باعث پاکستان کی سائنس کے لئے کوئی برتر صورت اختیار کرنا ناممکن تھا۔ پاکستانی سائنس کی علیحدگی کے اس مسئلے کو جس کا سامنا میں نے کیا، ختم کرنے کے لئے ہمیں بین الاقوامی امداد کا سہارا لینا پڑے گا۔ اس مدد کو متحرک کرنے کے لئے ۱۹۶۰ء میں ایک موقعہ آیا جب میں نے ویانا میں بین الاقوامی ایٹمی انرجی ایجنسی کی جنرل کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ میں نے اس کانفرنس میں یہ صلاح پیش کی کہ یو۔ این۔ او کی سائنسی ایجنسیوں کے توسط سے نمائندگی کرنے والی بین الاقوامی سائنسی اقوام کو اپنے محروم ممبران کی ذمہ داری سنبھالنی چاہئے یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق مختلف خالص اور تجرباتی سائنس کے نصابوں کے ایسے بین الاقوامی مراکز قائم کئے جانے چاہئیں جو ترقی پذیر ممالک سے آنے والے قلیل مدتی نمائندوں کو اپنی خدمات اور سہولتیں پیش کر سکیں۔ میں نے رفتار کی ایک اسکیم کا نظریہ رکھا جس کی رو سے ترقی پذیر ممالک سے آنے والے ذہین بلند پایہ علماء کو پانچ سال کی لمبی مدت کا تقرر دیا جائے جس سے وہ اپنی تعطیلات گرما ترقی یافتہ ممالک کے ہمسروں کے ساتھ گذار سکیں اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں اور اپنے ہمراہ نئے خیالات و نظریات اور نئی تکنیکیں اور نئی قوت متحرکہ لے کر اپنے ملک کو واپس جائیں۔ اس سے وہ علیحدگی جو کہ میں نے بھگتی ہے ختم ہو جائے گی جو میرے نزدیک سائنس دانوں کی اپنے ملک سے ہجرت کا (BRAIN DRAIN) خاص سبب تھی بمقابلہ ڈاکٹروں اور انجینئروں کے برین ڈرین کے۔

۱۹۶۱ء میں بلند معیاری سائنسی اور تکنیکی قدروں کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا۔ ایسوب ندی نے ۱۰,۰۰۰ میل لمبی ۲۳ ایکڑ رقبے کی آبپاشی کرنے والی نہر و کو جال پاکستان کو وراثت میں دیا تھا۔ ان میں سے کچھ نہریں اتنی لمبی تھیں جتنا کولوراڈو دریا ہے۔ لمبائی چوڑائی اور ڈھلان کے اعتبار سے ان کو اتنی اچھی طرح بنایا گیا تھا کہ پانی ان میں سے اس طرح روانی سے بہتا تھا کہ نہ تو ان کو کاٹ ہی پاتا تھا اور نہ ہی ان کی تلی میں تلچھٹ جمع کر کے اس کو پاٹ پاتا تھا لیکن ۱۹۶۱ء میں اس نظام میں کچھ خلل پیدا ہو گیا اور کچھ دس سالہ مدتوں سے اس نظام نے اپنی گذرگاہ میں آنے والے خطۂ زمین میں کھارے پانی اور پانی جمع ہو جانے سے پیدا ہونے والے تخریبی اثرات کو ختم کر کے اس متوقع پیداوار کو کافی حد تک دبا دیا تھا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے دوران ہر سال ایک ملین ایکڑ زمین ناقابل کاشت بنتی رہی تھی۔

۱۹۶۱ء میں صدر کینیڈی کے سائنسی صلاح کار پروفیسر وائزنر کی سرکردگی میں یونیورسٹیوں کے سائنس دانوں، زرعی ماہرین، انجینئروں اور ہائیڈرولوجسٹ کی ایک ٹیم بنائی گئی تاکہ اس سے واٹر لوگنگ اور کھارے پن کا مسئلہ حل ہو سکے۔ اس حل کے لئے اس ٹیم نے زمین کے کھارے پانی کو پمپ کر کے باہر نکالنے کی صلاح دی لیکن ساتھ میں یہ بھی تنبیہ کر دی کہ یہ پمپنگ اس سے ملحق ایک بڑے رقبے والے پانی کی مقدار اس پانی سے بڑھ جائے گی جو باہر نکالا جا رہا ہے۔ ایک ملین ایکڑ سے کم کے رقبے میں یہ پمپنگ کی گئی لیکن بے اثر رہی۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی جنگ میں بلیکٹ کو طلب کیا گیا تھا تاکہ وہ برطانوی بحریہ کو صلاح دے کہ بڑا جہازی بیڑہ کچھ بڑے بڑے حفاظتی مسلح دستوں کی شکل میں اٹلانٹک کو پار کرے یا بہت سے چھوٹے چھوٹے حفاظتی دستوں کے روپ میں جبکہ دشمن کی میرین کے خلاف تباہ کار دستوں کی تعداد محدود تھی۔ رقبے اور گھیرے کے تناسب کے اعتبار سے زیادہ خطرے کے لئے یہ تناسب کم ہوتا جائے گا اس بات کے مد نظر بلیکٹ نے بہت سے چھوٹے دستوں کے بدلے کچھ بڑے دستوں کی صلاح دی تھی۔ ریویلے کی ٹیم کی تجویز بھی پاکستان کے لئے اسی طرح سے سبق آموز تھی اور اسی انداز میں اس پر عمل درآمد بھی کیا گیا۔

میرا اقوام متحدہ سے اگلا تعلق اور اس محاذ پر اپنے ممالک کے نمائندہ اداروں کے بارے میں وہم باطل سے نجات ۱۹۶۲ء میں اس وقت ہوئی جب اس کے بعد والے سال میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر اقوام متحدہ کی کانفرنس ہونے کے سلسلے میں ڈاگ ہیمرشولڈ نے اظہار کیا۔ ترقی پذیر ملک کو تبدیل کرنے کے لئے اس نے جو منصوبہ پیش کیا اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ مجھے ڈاگ ہیمرشولڈ کے ساتھ ایک طویل اور واحد ملاقات کا شرف حاصل ہے جب میں ان سے غریب ممالک کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کا صحیح استعمال کئے جانے پر ان کے حق میں ہونے والی کامیابیوں کے سلسلے میں ملنے والی توقیر کا حصے دار بنا۔ انھوں نے واضح طور پر یہ بات تسلیم کی کہ اس مقصد پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مصارف کئے جانے چاہئیں اگر مناسب ٹیکنالوجی میسر بھی ہو۔ ترقی پذیر ممالک کے پیمانوں سے بھی زیادہ شدت سے انھوں نے یہ بات تسلیم کی کہ ترقی پذیر ممالک میں ہی خود میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے تحقیقی کام کے لئے ادارے قائم ہونے چاہئیں تاکہ وہاں ترقی ہو سکے۔ عالمی سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہم ترقیوں سے کم از کم آگاہی بھی بہت ضروری تھی۔ ایک ایسی آگاہی جس سے ایک ملک اپنی معاشی اور معاشرتی ضروریات کے مد نظر کسی ٹیکنالوجی کے انتخاب اور اس کے بارے میں گفت و شنید اور تردید کے قابل ہو سکے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ ایک ترقی پذیر ملک کے لئے صرف معمولی معلومات ہی ضروری نہیں ہیں بلکہ مدلل علم کی ضرورت ہے اگر اس میں تکنیکی ترقی کی پیوندکاری کرنی ہے۔

ہیمرشولڈ کی مجوزہ کانفرنس ۱۹۶۳ء میں ان کی افسوسناک موت کے بعد ہوئی۔ ہم نے ترقی پذیر ممالک کی طرف سے تکنیکی ترقی کے لئے بین الاقوامی بینک کی پشت پناہی میں عالمی سائنسی اور تکنیکی ایجنسی یعنی ٹیکنیکل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے قیام کی تجویز پیش کی۔ ملکی سائنسی ترقی کے فروغ کے علاوہ یہ اتھارٹی پلاننگ اور پروگرامنگ کے ساتھ ساتھ قابل عمل اور کارآمد نصابوں سے متعلق پروگراموں پر عمل درآمد کا کام بھی انجام دیتی۔ اقوام متحدہ کی تنظیم کی حیثیت سے یہ ملکی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ذہین افراد کو نئے طریقوں اور علوم کی تربیت دے کر اپنے ہمراہ ہم کاری کا فرض بھی انجام دیتی۔ یہ اتھارٹی اس بات پر بھی واضح طور پر زور دیتی کہ جدید دنیا اور اس کے مسائل جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہی پیداوار ہیں جسے کہ ایک معاشی ماہر منصوبہ بندی یکسر فراموش کر دیتا ہے۔

ہم نے ان کی تجویز بھی پیش کی اور اس کے حق میں رائے عامہ بھی ہموار کی لیکن ہمیں صنعتی ممالک کے ان نمائندوں کی جانب سے کوئی حمایت نہیں ملی جنھوں نے کسی ایسی سائنسی اور تکنیکی ایجنسی کے نظریہ کی عام طور پر بھرپور مخالفت بھی کی کیونکہ وہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اقوام متحدہ کا یہ ٹیکنالوجیکل قدم کمزور پڑ جائے اور منتشر ہو جائے۔ انھوں نے ترقی پذیر دنیا کو اپنی ٹیکنالوجی میں حصے دار بنانے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی سوائے اس طریقے کے جس کا ذکر میں پاکستان کے حوالے سے پین سلین کی صنعت کے بارے میں پہلے کر چکا ہوں۔ اس کانفرنس کا حاصل صرف سائنس اور ٹیکنالوجی پر اٹھارہ افرادی صلاح کار کمیٹی کا عمل میں آنا تھا۔ ہم گیارہ برس تک سال میں دو مرتبہ ملتے رہے اور گیارہ سال کی جانفشانی کے بعد ہم نے ایک دوسری اقوام متحدہ کی سائنس اور ٹیکنالوجی پر کانفرنس کی سفارش کی جسے ۱۹۷۸ء میں منعقد ہونا تھا۔ اس کا مقصد اسی سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ایجنسی کی تشکیل تھا جو پندرہ برس پہلے تجویز کی گئی تھی۔ اس مرتبہ ہمیں بہتر امیدیں نظر آتی ہیں کیونکہ تین ہفتے پیشتر ہی ڈاکٹر کسنجر نے مجوزہ کانفرنس کے لئے ہمیں اپنی نیک خواہشات سے نوازا ہے۔

مجھے اسی کم فہمی کا سامنا اپنی دوسری تجویز کے سلسلے میں بھی کرنا پڑا جو میں نے آئی۔ اے۔ ای۔ اے کے فورم سے نظریاتی طبعیات کے مرکز کے قیام کے لئے کی تھی۔ اور رکاوٹ ان ہی ممالک نے پیدا کی جہاں نظریاتی طبعیات درحقیقت نشو و نما پا رہی ہے۔ ایک نمائندے نے تو یہ تک کہا کہ نظریاتی طبعیات سائنس کی رولز رائس کی مانند ہے جو کہ

• یہ بات بار بار پُرزور انداز میں کہی جانی چاہئے کہ اناج کی کمی بالکل نہیں یہ صرف کھاتے پیتے لوگوں کے ذریعہ ضائع کیا جارہا ہے۔

• اقوام متحدہ ایک بنیم تنظیم ہے۔

• اسلامی ممالک ایک ٹیلنٹ فنڈ قائم کریں کیونکہ آخری فرق قابلیت سے ہی پڑتا ہے اور اس فنڈ سے استفادہ صرف اسلامی اور عرب ممالک تک محدود نہ رکھ کر سبھی ترقی پذیر ممالک کے لئے کام کیجئے۔

• سائنس دان آپ کا قیمتی سرمایہ ہیں ان کی قدر کیجئے

(ڈاکٹر عبد السلام)

ترقی پذیر ممالک کو تو بیل گاڑی سے زیادہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کے نزدیک پچیس ماہرین طبعیات اور پندرہ ریاضی دانوں کی جمعیت کی تربیت پاکستان جیسے چھ کروڑ کی آبادی کے ملک کے لئے بیکار محض تھی کیونکہ یہ وہ آدمی تھے جو پاکستانی تعلیم میں طبعیات اور ریاضی سے متعلق تمام ضابطے اور اصول سے مکمل طور پر غیر متعلق تھے۔ وہ خود ایک ماہر معاشیات تھا جو آئی۔ اے۔ ای۔ اے جیسی سائنسی تنظیم سے سابقہ رکھ چکا تھا۔ وہ پوری طور پر اس بات سے متفق تھا کہ ہمیں بلند معیار کے ماہرین معاشیات کی ضرورت تھی لیکن ماہرین طبعیات اور ریاضی دانوں کی ضرورت کی بات اس کے نزدیک محض ایک پر ضیاع عیاشی تھی۔

پہلی بار میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اقوام متحدہ کا نظام وسائل اعتبار سے کس قدر کمزور تھا۔ آج بھی بارہ برس بعد اقوام متحدہ کا خاندان بڑے مختصر وسائل کا حامل ہے۔ میں آپ کے سامنے کچھ اعداد رکھتا ہوں۔

جدول نمبر ۱
بجٹ اعداد (ملین امریکن ڈالر میں)

	۱۹۷۵ء	۱۹۸۰ء
یو۔این	۵۴۰	۶۲۰
یو۔این۔ڈی۔پی	۲	۶
یو۔این۔آئی۔ڈی۔او	۲۱	[illegible]
آئی۔اے۔ای۔اے	۲۲	[illegible]
ڈبلیو۔ایچ۔او	۱،۵	۱۲۰
یونیسکو	۷۵،۵ (بشمول ۱۰۰ یو۔این۔ڈی۔پی سے)	۳۰۵
آئی۔ایل۔او	۹۴	۱۳۵
ایف۔اے۔او	۱۱۷	غیر موجود
آئی۔سی۔اے۔او	۱۲	۱۲
آئی۔ایم۔سی۔او	غیر موجود	۱۱

ترقیاتی پروگراموں کیلئے اقوام متحدہ کے پاس موجود تمام فنڈ ملکر بھی اتنے نہیں ہوتے جتنے فورڈ فاؤنڈیشن میں اور یہ بھی ۱۴۰ اقوام کی خدمات کے لئے جن میں سے ۸۲ مایوس کُن حد تک غریب ہیں۔ اقوام متحدہ کی تشکیل مساوی اقوام کی جمعیت کے طور پر ہوئی تھی لیکن ان میں کچھ دوسروں سے زیادہ برابری رکھتے تھے۔ یہ معاشی طور پر کمزور تنظیم تھی کیونکہ متمول ممالک اس میں چندہ نہیں دیتے تھے۔ یہ بطور عمل درآمد گی ایک کمزور تنظیم تھی کیونکہ طاقتور ممالک اس کی قراردادوں کا احترام اسی صورت میں کرتے تھے جب ان کی اپنی خارجی پالیسیوں کے فیصلوں کی توثیق ہوتی تھیں۔

۱۹۶۴ء تک جب آئی۔اے۔ای۔اے نظریاتی طبعیات کے مرکز کے قیام کے لئے رضامند ہوئی تو اس کے بورڈ نے ۵۵۰۰۰ ڈالر بین الاقوامی مرکز کے لئے دیئے۔ خوش قسمتی سے اٹلی کی حکومت نے ۲۵۰۰۰۰ ڈالر سالانہ دینا منظور کر لیا اور اس طرح یہ مرکز تریستے میں قائم ہوگیا۔

مرکز کی کہانی مکمل کرنی ہے۔ اس مرکز نے ۱۹۶۴ء میں عملی میدان میں قدم رکھا۔ اب یہ مرکز آئی۔اے۔ای۔اے اور یونیسکو بمعہ یو۔این۔ڈی۔پی کہ جن میں سے دونوں چونتیس ملین ڈالر سالانہ چندہ دیتے ہیں کی ذمہ داری پر چل رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اٹلی کی حکومت ۲۵۰۰۰۰ ڈالر اور ایس آئی۔ڈی۔اے ۱۰۰۰۰۰ ڈالر گرانٹ کے طور پر سالانہ ادا کرتے ہیں۔ اپنے گیارہ سالہ قیام کے دوران اس مرکز نے ۹۰ ممالک سے ۶۰۰۰ سینئر ماہرین طبعیات کو مدعو کیا۔ ان میں سے ۴۰۰۰ ماہرین ۵۹ ترقی پذیر ممالک سے تھے۔ جہاں تک ترقی پذیر ممالک اور طبعیاتی تعلیمات کا تعلق ہے اس مرکز نے انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ان برسوں میں اس مرکز نے ٹیکنالوجی کے تبادلے پر زیادہ سے زیادہ زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں برسٹل کے پروفیسر جے۔ زیمان اور کوپن ہیگن میں چالرس کے پروفیسر اینڈ کوسٹ کی سربراہی میں بنی۔ مادے کی مخصوص حالت سے متعلق کمیٹی سے ہمیں بڑی مدد ملی ہے۔ دو ہفتے قبل ہم نے سمندری طبعیات اور کائنات کی طبعیات پر پہلے بڑے تین ماہ کے کورس کا افتتاح کیا جس میں تیس ترقی پذیر ممالک کے ساتھ سینئر ماہرین طبعیات شامل ہوئے۔ یہ مرکز جدید سائنسی علوم کے میدان میں اپنی قسم کا واحد ادارہ ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد بین الاقوامی انضباط کے ساتھ ادارے [illegible] بڑی تیزی سے [illegible] میری طرح آپ بھی ان دس سالوں کی تاریخ سے بخوبی واقف ہیں کہ کس [illegible] وہ صدر کینیڈی جن سے عالمی ترقی کی امیدیں وابستہ تھیں قتل کر دیئے گئے۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس طلبا میں انقلاب آیا اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ تمام ماحول [illegible] ہے میں نے محسوس کیا اور اب بھی محسوس کرتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ ترقی پذیر ممالک نے ایک عظیم موقع ایک عظیم معاہدہ، قوت کا ایک عظیم وسیلہ کھو دیا جب عالم کے نوجوانوں کی تمام تر قوت ماحول کے بگاڑ کے واحد مسئلے پر مرکوز ہوگئی تھی اور عالمی ترقی کے دل پذیر حق کی تائید نہیں کی گئی تھی۔ ان برسوں میں اشیاء کی [illegible] قیمتوں کی [illegible] کرنے کی خاطر مجوزہ یو۔این۔سی۔ٹی۔اے۔ڈی کی کانفرنسوں کو [illegible] میں یہ یاد دلانا بہتر سمجھتا ہوں کہ پیٹرولیم کی قیمت مستقل طور پر [illegible] کے دوران گری اور ایک ڈالر فی بیرل کے حساب سے گری ہوئی قیمتوں نے توانائی کے استعمال کو چھ فیصدی سے گیارہ فیصدی تک بڑھا دیا۔ یو۔این۔سی۔ٹی۔اے۔ڈی کی تجاویز یعنی اس کی اسٹاک کی گذارشات اور اشیاء کی قیمتوں [illegible] وغیرہ کو بڑے نفرت آمیز تمسخر سے دیکھا گیا اور آج بھی لندن کے بااثر [illegible] ۲۰ اگست کو اقوام متحدہ کی کانفرنس کے موقع پر اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے: "یہ خیال کہ ہر شے کی قیمت اس کی مانگ کے اعتبار سے طے نہ ہو بلکہ اس کی بڑھتی ہوئی صنعتی لاگت کے مطابق طے ہونی چاہئے کسی کانفرنسی فرمان کے ذریعے بہم رسانی اور مانگ کے قانون کو منسوخ کرنے کی کوشش ہے۔ صنعتی ممالک کو اس تجویز پر کسی بھی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دینا چاہئے۔" اور اس ایک سال میں صنعتی قیمتوں کے اشاریہ ۴۰ فیصدی تک بڑھ گئے جبکہ اشیاء کی قیمتوں کا اشاریہ ۱۷ رہا۔ اس طرح اس ایک سال میں ہی غریب نے امیروں کی رفاہی معاشیات میں اپنی کمائی کی ۲۶ فیصدی امداد دی ہے۔

۱۹۷۲ء میں اسٹاک ہام میں ایک عظیم کانفرنس ماحول پر ہوئی۔ اس کانفرنس کی اہمیت صرف اسی وجہ سے نہیں تھی کہ اس میں ماحول کے بگاڑ اور اس کے بگاڑنے میں ضرورت سے زیادہ حصہ لینے والے ممالک پر انگلی اٹھائی گئی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس میں اٹھائے گئے مسائل کو حل کرنے کے نوع انسانی کے باہمی انحصار کو بہت اہمیت دی گئی تھی۔

۱۹۷۲ء میں ہی کلب آف روم رپورٹ آن آؤٹر لمٹس ٹو گروتھ کا نزول ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ عالمی وسائل محدود ہیں اور صنعتی معاشیات کی لامحدود ترقی کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ یہ بات عام نہیں ہے کہ ۱۹۷۲ء کے درمیان میں بہت جلدی ہی غریب ممالک نے گیہوں کی قیمت سیدھی دوگنی ہو جانے کی شکل میں اس کے اثرات محسوس کئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روس میں فصلیں خراب ہو جانے کے باعث انھیں تیس ملین ٹن اناج خریدنے پر مجبور ہونا پڑا جس سے عالمی غلے کے ذخائر تقریباً خالی ہوگئے۔ یہ تیل کی قیمتوں میں اضافے کے اسباب میں سے ایک تھا۔ اسی میں غیر ممالک کے امدادی منصوبوں اور وسائل کی منتقلیوں میں کمی کو بھی شامل کر لیجئے جو کہ مغربی ممالک کا مجموعی افتراق تھا۔ اب آپ عارضی بحران کے آغاز کا اندازہ کر سکتے ہیں یعنی معاشی دیوالیہ پن جہاں سے میں نے اپنا لیکچر شروع کیا تھا۔

بیرونی امداد کی کہانی کو مکمل کرنے کے لئے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ متمول اقوام نے پچھلے سال سے غیر ممالک کی امداد کے طور پر اپنا جی۔این۔پی تین فیصدی مقرر کیا ہے جبکہ ۱۹۶۰ء میں ۲۵ فیصدی تھا اس کے برعکس سویڈن نے بڑی فیاضی سے ۲۷ فیصدی مقرر کیا، انگلینڈ اور امریکہ نے ۳ فیصدی اور ۵ فیصدی دینا طے کیا ہے۔ عالمی بینک کے اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ء تک ۱۔ ممالک کا اوسط ۲۸ فیصدی اور امریکہ کا ۱۸ فیصدی ہوگا۔ اس کا مقابلہ امریکہ کے ان چندوں سے کیجئے جو مارشل پلان کے آغاز میں ۲۹ فیصدی تھے۔ متمول ممالک کی وزارتیں عموماً اقوام متحدہ کے ایسے غیر فطری امدادی مقاصد کو جن میں اپنی جی۔این۔پی کا ۷ فیصدی مقرر کرنا ہو مسترد کر دیتی ہیں شاید پھر بھی اس مقصد کی تکمیل ہو جاتی اگر انھوں نے اپنی اضافی دولت کا ۱۲ فیصدی حصہ جو ایک ہزار ڈالر فی کس ہے جس کی بات میں پہلے بھی کر چکا ہوں دے دیا ہوتا جو کہ صنعتی ممالک کو آئندہ کچھ ہی سالوں میں دستیاب ہونے کی توقع ہے۔ اقوام متحدہ کی ابھی ختم ہونے والی کانفرنس میں ای ای سی کے وزراء نے ۱۹۸۰ء تک ۷ فیصدی ٹارگیٹ کی تکمیل کے لئے حامی بھری ہے لیکن بدقسمتی سے انگلینڈ اور امریکہ نے اپنی معذوری ظاہر کی ہے۔

ان پس حقائق کے مدنظر اور یہ حقیقت جان کر کہ ترقی یافتہ دنیا ایسا کوئی میثاق پیدا نہیں کر پائے گی جو اقوام کے درمیان سماجی انصاف کی تبلیغ کرے ترقی پذیر ممالک نے ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ کے فورم سے نئے معاشی نظام کو آواز دینا طے کیا۔

نیا بین الاقوامی معاشی نظام

بین الاقوامی معاشی نظام کیا ہے؟ ریو کا اعلانیہ جو یو۔این۔او کی قراردادوں سے زیادہ پُراثر ہے اس تمہید سے شروع ہوتا ہے "ترقی یافتہ ممالک نے عام طور پر تبدیلی اور تعاون کے معاملات میں شدید غیر آمادگی ظاہر کی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے تمام وسائل اور سستے خام مال کو استعمال کر کے بھی وہ اپنے بازاروں میں گھسنے کا ان کو راستہ نہیں دے رہے ہیں۔ وہ ان کی طرز زندگی، ان کے طور طریق اور پیمانے بدلنے کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے اس ضرورت کو جس کے قیام کے لئے عالمی وسائل کا ایک غیر متناسب حصہ درکار ہے۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی قوت کو خود غرضی پر مبنی تمام ذاتی مفادات کے تحت عالمی سمندروں میں اکساتے ہیں، سائنسی افرادی طاقت اور اشیاء، غرض نوع انسانی کے تمام وسائل کو عالمی تباہی کے اسلحہ کا ڈھیر لگانے میں برباد کر رہے ہیں۔"
اسی دستاویز میں مزید کہا گیا ہے "تیسری دنیا کی جدوجہد معاشی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہے اس لئے ہے کہ گفت و شنید کی میز کے گرد بیٹھ کر مساوی حقوق، مساوی مواقع اور مستقبل میں ترقی کی مساوی سہولتوں کے بارے میں بات چیت کی جائے۔ آخری تجزیہ کے طور پر ہمیں نئے بین الاقوامی نظام کی مانگ پر تاریخی انداز و اطوار کا جزو سمجھ کر ایک تحریک کی حیثیت سے غور کرنا چاہئے۔"

اقوام متحدہ کی قرارداد نئے نظام کے سلسلے میں کچھ حد تک خاموش ہے "یہ نوع انسانی کے افلاس اور اس میں پلنے والی تفریق کے خاتمے کے اقرار سے شروع ہوتی ہے یہ صنعتی اشیاء اور خام مال کے درمیان معقول اور منصفانہ تعلق کی بات کرتی ہے اور یہ خوراک اور اسلحہ کے معاملوں میں ہونے والے بے ضرورت اصراف یا ضیاع کی بات کرتی ہے۔"

اقوام متحدہ کی قراردادوں میں بیان شدہ تصورات کو کس طرح حقائق میں بدلا جائے اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں خوراک اور افواج کشی پر ہونے والے مصارف کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا۔

خوراک

نومبر ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ نے روم میں خوراک کے مسائل پر ایک کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل اعلان کیا گیا: "دس سال عرصے کے اندر کوئی بھی بچہ بھوکا نہیں سوئے گا، کوئی بھی خاندان اگلے دن کی روٹی کی فکر سے نہیں گھبرائے گا اور کسی بھی انسان کا نشو و نما ناقص غذا کے باعث نہیں رُکے گا۔" اس مقصد کے حصول کے لئے ایک عالمی فوڈ کاؤنسل عمل میں لائی گئی جس کا مقصد تھا ہر سال کم سے کم ایک کروڑ ٹن اناج مدد کے طور پر تقسیم کرنا، غریب ممالک کی خوراک کی پیداوار میں سالانہ ۲٫۹ فیصدی کا اضافہ بین الاقوامی زرعی اہتمام کے ذریعے کرنا۔

۲۹ جون ۱۹۷۵ء کو لندن ٹائمز نے رپورٹ دی "عالمی فوڈ کاؤنسل دو بجے دن کے اپنی افتتاحی ملاقات کے بعد کل ختم ہوگئی۔ اسے مغربی موقع پرست افراد کے ڈھونگ اور دکھاوے کی لیپا پوتی کے باعث ملنے والی ناکامی سے بچا لیا گیا۔ فرانس، جرمن اور اٹلی فی الحال ای۔ای۔سی کی مدد ۰٫۱۲ کروڑ ٹن سے بڑھا کر ۰٫۱۶ کروڑ ٹن کر دینے پر راضی نہیں ہوئے ہیں۔ روم میں اس پر بہت احتجاج کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ انگلینڈ نے اپنی دو رُخی مدد کو بڑھانے کی دھمکی دی بشرطیکہ اس کے ساتھیوں کی بے حسی جاری رہے ایک کروڑ ٹن کا وعدہ جو ۱۹۶۰ء کے خوراکی معیار سے کافی کم ہے، آج تک حاصل نہیں ہوا۔"

کیا دنیا میں خوراک کے ذخائر واقعی اتنے کم ہیں کہ غریب ممالک کی ناگزیر بھکمری کے باوجود بھی یہ ایک کروڑ ٹن کا نصب العین لاینحل بن گیا ہے؟ اس کا جواب ہے کہ نہیں۔

یہ بات بار بار پُرزور انداز میں کہی جانی چاہئے کہ اناج کی کمی بالکل نہیں ہے۔ یہ صرف کھاتے پیتے لوگوں کے ذریعے ضائع کیا جارہا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے متمول اقوام نے گائے کے گوشت اور مرغ وغیرہ کی شکل میں اپنی فی کس خوراک میں ۲۵۰ پونڈ سالانہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ ایک خصوصی پالیسی کے تحت اس وقت کیا گیا تھا جب امریکہ میں عالمی مانگ سے چھ کروڑ ٹن زائد اناج پیدا ہو رہا تھا اور جبکہ کاشت کے رقبے کو گھٹا کر آدھا کر دیا گیا تھا۔ یہ تقریباً ہندوستان کی پوری سالانہ خوراک کے برابر ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ ۱۹۶۵ء میں صنعتی ممالک غذائی معاملے میں خود کفیل نہیں تھے۔ ایک چھوٹے سیاہ انگور کے دانے کے برابر فی کس خوراک میں تخفیف کر کے بہ آسانی اتنا حاصل کیا جا سکتا ہے جو ہندوستان جیسے بر عظیم کے ایک تہائی حصے کی کفالت کے لئے کافی ہوگا۔

اب ہم قوت اسلحہ پر غور کریں گے اور ساتھ ہی اس بات پر بھی کہ اسلحہ کی تخفیف ہو۔ ۱۹۷۳ء میں عالمی افواجی مصارف ۲۴۵ بلین ڈالر تھے۔ یہ رقم اس رقم کا ۱۲۲ گنا ہے جو اقوام متحدہ کے توسط سے عالمی ترقی اور عالمی امن کے لئے ہونے والی بین الاقوامی اسکیموں پر خرچ ہوگی (عالمی بینک کے علاوہ یہ رقم ۲٫۵ بلین ڈالر کے قریب ہے) عظیم طاقتوں نے اس ۲۴۵ بلین ڈالر میں سے ۵۰ فیصدی خرچ کیا اور ۳۰ فیصدی فوجی معاہدوں پر خرچ کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۵ء تک تیسری دنیا کے مصارف بھی اس سلسلے میں ۶ فیصدی سے بڑھ کر بدقسمتی سے ۱۷ فیصدی ہو گئے یعنی ہم بھی اس سلسلے میں پوری طرح بے داغ نہیں ہیں۔ اب عالمی فوجی مصارف تمام افریقہ اور جنوبی ایشیا کی جی۔این۔پی سے زائد ہیں۔ دو دس سالہ مدتوں میں ۱۹۶۰ء کا اور ۱۹۷۰ء کا کل فوجی خرچ ۴۰۰۰ بلین ڈالر تھا جو کہ ایک سال میں پورے عالم میں بنے صنعتی سامان اور دیگر امور پر آنے والے مصارف سے زیادہ ہے۔ جب ہم آدمیوں اور اشیاء سے متعلق حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو اخراجات اور بھی خوفناک شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ متمول ممالک میں تقریباً سارے خام مال کا ۷ فیصدی اسلحہ ساز صنعت میں ضائع ہوتا ہے۔ اس میں لوہا، تیل، ٹن، تانبہ اور باکسائٹ شامل ہیں۔ فوجی اور دفاعی مقاصد کے لئے تقریباً پانچ کروڑ افراد متعین ہیں تقریباً ۵ لاکھ سائنس داں اور انجینئر جو پوری دنیا کی سائنسی اور ٹیکنالوجیکل افرادی قوت کا آدھا ہے، فوجی امور سے متعلق تحقیقی کام میں مصروف ہے جس پر ۲۰ بلین سے ۲۵ بلین ڈالر کا خرچ آتا ہے۔ یہ رقم پورے عوامی اور انفرادی ترقیاتی تحقیقی کام پر آنے والے مصارف کی ۴۰ فیصد کا ہے۔ اس کا مقابلہ اس ۵۰ لاکھ ڈالر سے کیجئے جس کو ہم پانچ برس کی کوشش کے بعد اس بین الاقوامی فاؤنڈیشن فار سائنس کے لئے جمع کر پاتے ہیں جس کا پہلا عام اجلاس آج اسٹاک ہوم میں ہو رہا ہے۔ اب صورت حال بہت واضح ہوگئی ہے۔ یہ غریب ممالک نہیں جو عالمی توازن کو خطرے میں ڈال رہے ہیں [illegible] متمول ممالک، ان کی آپسی زور آزمائی اور فوجی قوت میں اپنی اجارہ داری کو برقرار رکھنے کی خواہشات ہیں جو عالمی عدم توازن کی ذمہ دار ہیں۔

نئے بین الاقوامی معاشی نظام کی بابت یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ نئے نظام کی مانگ دراصل ادنیٰ درجے کے رہائشی معیار اور تمام شہریوں کے معاشی تحفظ کی مانگ ہے یہ نظام ترقی کے حصول کی سوچی سمجھی پالیسی ہے۔ قومی پیمانے پر سماجی اور معاشی مقاصد کا حصول پورے طور پر انفرادی کوششوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ یہ کام پوری قوم کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی پیمانے پر سماجی اور معاشی مقاصد کا حصول دنیا کی تمام اقوام کی باہمی اور متواتر کوششوں سے ہی ممکن ہے یعنی بنی آدم کا پورا خاندان لگ کر ہی اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک نفسیاتی بنیاد پر اپنی وہ شان اور خودداری حاصل کرنا چاہتے ہیں جو صدیوں تک ان کا سرمایہ حیات رہی ہے اور جسے انھوں نے مغربی حکومت کے مختصر دور میں جو کہ صنعتی اور ٹیکنالوجیکل دو صد سالہ انقلاب پر منحصر ہے کھو دیا یہ حقیقت بھی کہ دنیا کے سبھی خطوں میں ہر ملک کو یکے بعد دیگرے متواتر کامیابی کے ساتھ ٹیکنالوجی پر مہارت حاصل ہوئی ہے انھوں نے نظر انداز نہیں کی ہے جو اب بھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک اس زمین کے غیر مزروعہ خطے اور کم ستعمال شدہ خطوں میں لامحدود ہجرت نہیں چاہ رہے ہیں اور انھوں نے کبھی بہت بڑے پیمانے پر آمدنی، دولت اور وسائل کی منتقلی بھی نہیں چاہی۔ وہ تو ٹیکنالوجی اور تجارتی امور میں معقول اور منصفانہ حصہ مانگ رہے ہیں۔ شاید بین الاقوامی ذرائع آمدنی کو یعنی بین الاقوامی عوام پر غریب ممالک کے سب سے غریب طبقے کے لئے محصول لگا کر قومی منتقلیوں سے تبدیلی کو بڑھانے کا وقت آپہنچا ہے۔ یہ بین الاقوامی محصولی نظام اور ترقی امداد کے لئے خودکار منتقلیوں پر مبنی بین الاقوامی خزانے کے قیام کی طرف پہلا قدم ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسٹاک ہام میں ۱۹۶۹ء کے نوبل سمپوزیم "پلیس آف ویلیو ان اے ورلڈ آف فیکٹس" کے موقعے پر لائنس پالنگ نے یہ نظریہ پیش کیا تھا جسے بڑی سرد مہری سے لیا گیا۔ اس وقت یہ حد سے زیادہ بنیادی محسوس ہوتا تھا لیکن اب غالباً وقت آگیا ہے کہ اس کی شروعات ان بین الاقوامی مشترکات سے کی جائے جو عالمی سمندروں کے وسائل سے عطا کئے ہیں، ایک وسیلہ جو مکمل طور پر قومی ریاستوں کے درمیان ابھی تراشا نہیں جا سکا ہے۔

جدول نمبر ۲
اناج کے ۱۹۷۲ء کے لئے اضافے اور کمیاں
(ملین ٹن میں)

شمالی امریکہ	+۹۱
لاطینی امریکہ	−۲
ایشیا	−۴۲
افریقہ	−۵
مشرقی یورپ	−۲۷
مغربی یورپ	−۱۹

سمندر

۱۹۷۴ء میں کراکس، وینی زویلا میں ہوئی ۱۴۸ اقوامی لاء آف دی سی کانفرنس

نے اپنے آخری اجلاس میں جنیوا میں گفت و شنید کی تھی۔ یہ واحد غیر اہم گفت و شنید کا اہم موضوع تھا جس میں آج بھی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔ ۱۹۷۵ء کے لئے سوچا گیا یہ معاہدہ سب سے اہم دستاویز ہوگی جو ۱۹۴۵ء کے بعد سے اقوام متحدہ پیش کرنے گا۔ اس معاہدے میں علاقائی سمندروں کی حد ۳ سے بڑھا کر ۱۲ بحری میل کر دی جائے گی اور ساحلی ریاست کے تحت ایک مخصوص معاشی علاقہ ہوگا جو ۲۰۰ میٹر گہرائی والے دو سو میل تک پھیلا ہوگا۔ اگر یہ آخر میں منظور ہوگیا تو ایک مکمل تباہی ہوگی حالانکہ کچھ ترقی پذیر ممالک اس سے فیضیاب بھی ہوں گے۔ سمندری علاقے میں تقریباً ۱۵۰۰ بلین بیرل پیٹرولیم موجود ہے، فی الوقت دنیا کا تقریباً [illegible] فیصدی تیل سمندروں سے حاصل ہوتا ہے لیکن مستقبل کے لئے اس میں تیل کے زبردست ذخیرے ہیں۔ تقریباً ۱۸ بلین ڈالر کی معیاری پروٹین والی مچھلیاں ان سے پکڑی جاتی ہیں اور شمالی پیسفک کی گہری تہہ سے ۴۰ ملین ٹن تانبہ، مینگنیز، نکل اور کوبالٹ سالانہ نکلنے کی امید ہے۔ اس ۴۰ ملین ٹن کا آج خرچ کئے جانے والے ۳۰ ملین ٹن سالانہ سے مقابلہ کیجئے۔ سمندر سے حاصل ہونے والی ان اشیاء کے [illegible] حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ ہر وقت اپنی تجدید کرتی رہتی ہیں یا تو شاید اس لئے کہ یہ مونگا کی طرح آرگینک ہیں یا اس لئے کہ کوئی غیر واضح آیونائزیشن کا طریقہ نامعلوم طریقے پر کارفرما ہے۔

اس مجوزہ معاہدے کے اثر سے سمندر کا ۹۲ فیصدی رقبہ ان دس خوش نصیب ساحلی ریاستوں کے تحت آجائے گا جن میں اکثر کی آمدنی فی کس ایک ہزار ڈالر سے زائد ہے جبکہ ۵۱ ممالک کو صرف ایک فیصدی ملے گا۔ میں کوئی قانونی ماہر نہیں ہوں لیکن کسی بھی بین الاقوامی سوجھ بوجھ رکھنے والے شخص کے لئے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ آج قومی حکومت کے دقیانوسی تصور کی جگہ عالمی حکومت کے تصور کی ضرورت ہے جو قومی اور بین الاقوامی حدود کی باہمی وابستگی کو ایک ہی علاقے میں پہنچنے کی اجازت دیتی ہے۔ موجودہ طور پر یہی معاہدہ ہو سکتا ہے جس کی رو سے ایک بین الاقوامی سی بیڈ ریسورسیز اتھارٹی بنائی جائے گی جو سمندر کی معدنیاتی تحفظ دے گی اور گہرے سمندری معدنیات سے ہونے والی آمدنی براہ راست جمع کرنے کی مجاز ہوگی۔ بہرحال اور بھی بالکل سامنے کے وسیلے یعنی تیل کے بارے میں ابھی مباحثے جاری ہیں کہ آیا تیل کے معاوضے سے ہونے والی آمدنی کو ایک ایسے بین الاقوامی فنڈ میں جمع کیا جائے جسے ترقی پذیر ممالک کے حق میں استعمال ہونا ہے۔ کناڈا نے ایک فیصدی سی بیڈ آئل جمع کرنے کی تجویز رکھی تھی۔ امریکی حکومت نے ۲۰۰ میل کی حدود سے باہر کی علاقوں سے آمدنی جمع کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ لیکن ابھی تک عالمی ترقی کے لئے وقف معقول بین الاقوامی حصہ دینے کی بات کسی نے بھی بہ بانگ دہل نہیں کی ہے۔

انداز فکر بالکل اس کا مخالف ہونا چاہئے۔ سمندری علاقوں سے ہونے والی کافی آمدنی بین الاقوامی جمعیت کو دی جا سکتی تھی۔ اس کا بیس فیصدی ہی ترقی پذیر ممالک کے لئے ۶ سے ۱۲ بلین ڈالر سالانہ مہیا کر سکتا تھا۔ بین الاقوامی سمندری وسائل ادارہ (بین الاقوامی سی بیڈ ریسورسیز اتھارٹی) عالمی اداروں کے لئے نمونہ بن سکتی تھی جس کا کام اسلحہ پر کنٹرول، تخفیف اسلحہ اور عالمی وسائل کا انتظام ہوتا۔ ۱۹۰۵ء کا جنیوا معاہدہ آخری اور واحد موقع ہو سکتا ہے اس یقین دہانی کا کہ نوع انسانی کی مشترکہ وراثت کا تصور محض تصور ہی نہیں ہے۔

یہ بتا کر کہ بین الاقوامی کانفرنس میں درحقیقت کیا ہوا میں اپنی بات ختم کر دوں گا۔ کیا کامیابیاں ملیں؟ ڈاکٹر ہینری کسنجر نے ایک اختلاف کے خطرہ سے جو سرد جنگ سے زیادہ خطرناک ہے [illegible] کہ اگر غریبوں کی مانگ پر کارروائی نہیں کی گئی [illegible] اس سیارے کے شمال و جنوب کے درمیان تقسیم [illegible] خوفناک بن سکتی ہے جتنی سرد جنگ کے بدترین ایام۔ ہم ایک خوفناک [illegible] کوشش کے مترادف ایسا دور ہوگا جو تعاون کی جڑوں کو کھوکھلا کر دے گا، بین الاقوامی اداروں کو کاٹ دے گا اور ہر ترقی کو ناکام بنا دے گا۔"

ڈاکٹر کسنجر اور امریکہ نے باہمی عالمی ترقی میں معاون ضروریات کی تکمیل کے لئے بہت سے اداروں کے قیام کا وعدہ کیا ہے۔ ان میں سے دو ہیں:

۱۔ "ترقی کے لئے سہولت کی ضمانت" جس کے قیام کا مقصد تھا برآمدی کمائیوں کے بدنما سلسلے کے سبب بڑھنے والی قیمتوں کو روکنا اگرچہ اشاریہ کی بات بالکل مسترد کر دی گئی تھی۔

۲۔ منظمانہ ذہن اور بڑی ٹیکنالوجی کے لئے راہ ہموار کرنا اور خاص طور سے بین الاقوامی توانائی اداروں، ٹیکنالوجیکل انفارمیشن کے مبادلے کے لئے بین الاقوامی مرکز اور ایک بین الاقوامی صنعتی ادارے کا قیام بہرحال ہم نے جن ماہرین طبعیات کو تربیت دی ہے وہ اپنے ممالک کی ترقی میں مناسب کردار ادا کریں گے۔ اگرچہ مجھے توقع ہے کہ یہ نئے مراکز ان مایوسیوں کی دست برد سے محفوظ رہیں گے جس کا خدشہ اقوام متحدہ کے ادارے کو گیارہ سال متواتر جھیلنے کے دوران مجھے رہتا رہا ہے۔ اقوام متحدہ سے رابطوں کے دوران ایک شخص کو جس مایوس کن بات سے سابقہ پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک حکومت کا ایک شعبہ کسی بات کا وعدہ کر چکا ہے مگر اسی حکومت کا دوسرا شعبہ اسے لاپرواہی سے رد کر دیتا ہے۔ دراصل ہر شعبہ وہ [illegible] تفصیلات مانگتا ہے جو کہ اقوام متحدہ کو دی جا رہی ہیں۔ جہاں تک تریستے کا سوال ہے تو اس مرکز کی رپورٹ کے لئے پانچ کمیشن بیٹھے ہیں اور سال کے آخر تک مزید دو کمیشن اس کی رپورٹ تیار کریں گے۔ اور یہ ہر سال ہوتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے فنڈ بڑے محدود ہیں، یہ ایک بنیم تنظیم ہے۔ اور اس اقوام متحدہ کے تحت کسی تحریک

باقی صفحہ ۱۷ پر

ڈاکٹر عبد السلام کی عظیم توقعات

جو:-

وہ تیسری دنیا کے غریب ممالک کی فلاح و بہبود کیلئے رکھتے تھے!

ڈاکٹر عبد السلام مرحوم نے "سائنس ٹیکنالوجی (ماحولیات کے میدان میں یورپ کی عالمی ذمہ داریاں" کے عنوان پر اپنا حیرت انگیز لیکچر دیتے ہوئے یورپ کو یاد دلایا کہ اس کی خوشی تیسری دُنیا کی خوشحالی کے بغیر ہرگز پائیدار نہیں ہو سکتی چنانچہ آپ نے تیسری دُنیا کے ممالک میں درج ذیل پروگراموں کی طرف توجہ دلائی

(ادارہ)

مختصراً میں عالمی فریضہ کی ایک فہرست آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا جن میں سے کچھ تو نئی سائنسی تحقیق سے متعلق ہیں اور کچھ انفرام سے۔ میں واشنگٹن ڈی۔ سی میں مقیم عالمی وسائل کے ادارے کی مرتب کردہ فہرست سے اکالوجی کے ان حقیقی سنجیدہ مسائل کو پیش کروں گا جو عالمی توجہ کے مستحق ہیں۔

۱۔ کاشت اور چارے کے لئے درکار آراضی کا تجاوز، کٹاؤ، غیر زراعتی کاموں میں استعمال اور دوسری وجوہات کی بنا پر لگاتار فقدان۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں کاشت اور چارہ کے لئے درکار زمین ہر سال دو کروڑ ہیکٹر کی در سے عنقریب پیداوار کی مرتکب ہوتی جا رہی ہے۔

۲۔ دنیا کے گرم خطہ کے جنگلات کا اختتام جس کی وجہ سے جنگلوں سے وابستہ وسائل کا نقصان ہو رہا ہے۔ تشویش ناک آفتیں تباہیاں مثلاً کٹاؤ، سیلاب وغیرہ اور دوسرے منفی اثرات۔ کہا جاتا ہے کہ کاٹ کر برابر کر دیئے جانے کی وجہ سے موجودہ صدی کے اختتام تک کوئی دس کروڑ ہیکٹر کے رقبہ میں گرم علاقوں کے جنگلات کا صفایا ہو جائے گا۔

۳۔ جنگلوں سے وابستہ حیوانات کے خاتمہ کے باعث ہیئتوں کا نیست و نابود ہو جانا اور ان سے منسلک توالد و تناسل کے وسائل کا اختتام۔ ایک تخمینہ کے مطابق ہر برس ایک ہزار سے بھی زیادہ نباتاتی ہیئتیں ناپید ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی در میں اضافہ ہونے کے قوی امکانات ہیں۔

۴۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی تیسری دنیا میں نئے نئے شہروں کا آباد ہونا اور غیر مناسب اکالوجی سے بھاگے ہوئے پناہ گزینوں کے مسائل۔ ہماری آبادی اگلی صدی کی ابتدائی دہائیوں تک دوگنی ہو جانے کے امکانات ہیں اور ترقی پذیر ممالک کے تقریباً نصف باشندگان شہروں میں رہنے لگیں گے جن میں سے کچھ تو غیر منصرم حد سے تجاوز کر جائیں گے۔

۵۔ تازہ پانی کے ذرائع اور [illegible] کی موجودہ زمانے میں دنیا کی تمام بیماریوں میں سے کوئی ۸۰ فیصدی بیماریاں پانی کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔

۶۔ سمندر کے ماحول کو غیر مناسب مقدار میں مچھلیاں پکڑ کر متعلقہ ہیئتوں کو تباہ کرکے [illegible] زیادہ مچھلیاں پکڑنے کی وجہ سے دنیا کی کوئی پچیس بے مثل [illegible] مچھلی کی شکار گاہیں آج مچھلیوں سے قطعاً محروم ہو کر رہ گئی ہے۔

۷۔ پیسٹی سائڈ (PASTICIDE) اور دیگر پُرخطر اشیاء اور انسانی فضلہ میں شامل جراثیم وگندے نالوں کے پانی میں موجود امراض سے انسانی صحت کو تخویف و اندیشہ۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے ۱۵ سے ۲۰ لاکھ افراد پیسٹی سائڈ کے زہریلے اثر سے بری طرح اذیت سے دوچار ہوتے ہیں اور کوئی دس ہزار افراد ہر برس ہلاک ہو جاتے ہیں۔

۸۔ فضا میں گرین ہاؤس (GREENHOUSE) گیسوں کے اضافہ کے باعث آب و ہوا کا تبدیل ہو جانا۔ کاربن ڈائی آکسائڈ اور دیگر گیسوں کے فضا میں برابر بڑھتے جانے کی وجہ سے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ حرارت میں اضافہ اور مقامی آب و ہوا کو تبدیل کر دینے والی گرین ہاؤس تاثیر (GREENHOUSE EFFECT) پیدا ہو جائے گی۔ گیسوں کا یہ اضافہ خاص طور پر زمین سے نکالے ہوئے ایندھن کو جلانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کیا مقامی آب و ہوا کی تبدیلیاں ہوں گی بلکہ یہ ہے کہ کس قدر ہوں گی۔ انواع و اقسام کی وجوہات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غریب ممالک پر آب و ہوا کے تبدیل ہونے کا عتاب زیادہ ہوگا۔

۹۔ تیزاب آلود بارش اور عموماً تیزابوں کے پیچیدہ مکسچروں اوزون (OZONE) اور دیگر فضائی آلودگیوں کے مجھلی کی شکار گاہوں جنگلات اور فصلوں پر برے تاثرات۔

۱۰۔ توانائی کے لئے درکار ایندھن کی بدانتظامیاں اور توانائی کے وسائل پر دباؤ۔ ان وسائل میں جلانے کی لکڑی بھی شامل ہے جو غربا کے لئے تیل کی حیثیت رکھتی ہے جہاں ترقی یافتہ ممالک میں توانائی کا بحران ایک عارضی آموزش کا مصداق ہے وہیں ترقی پذیر ممالک میں تیل کی اونچی قیمتوں اور جلانے کی لکڑی کے فقدان نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی ہے۔

جہاں ہم ایسے عالی فریضہ خواہ وہ سائنس سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں کا تذکرہ کر رہے ہیں اور ان کے ہو جانے کا خواب دیکھ رہے ہیں وہیں میں ایک اور فہرست کا ذکر کرتے ہوئے اپنی گفتگو کو ختم کرنا چاہوں گا۔ یہ فہرست ناکاجھا نے مرتب کی ہے اور وہ اسے خواب برائے بنی آدم کہتا ہے۔ اس نے چند عالمی سُپر انفرا اسٹرکچر (SUPER INFRASTRUCTURE) والی تجاویز پیش کی ہیں جن میں ایک نئے عالمگیر معاہدہ کے عنصر تلاش کئے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ہتھیار بنانے کے بجائے اگر امیر ممالک اس کے سپر پروجیکٹوں کی تعمیل کریں تو یہ صنعت و حرفت تیری مطالبات میں تحریک پیدا کرنے کی حامل ہوگی قرین قیاس اور امید افزا بات یہ ہے اگر ان تجاویز پر عمل کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں طرح کے ممالک کی جی۔ این۔ پی یعنی کل ملکی پیداوار بڑھے گی بلکہ روزگار کے لئے ذرائع بھی پیدا ہوں گے۔ ناکاجھا کا خیال ہے کہ وقت آگیا ہے کہ بنی آدم ایک جرأت مند، باہمت اور مستحکم بصیرت سے کام لے۔ ایک ایسی بصارت جو پندرہ روزہ تنگ نظر قومی مفاد سے پرے ہو جیسا کہ پیغمبر بادشاہ سلیمان نے بائیبل میں کہا ہے کہ جہاں بصیرت نہیں ہے وہاں انسانیت فنا ہو جاتی ہے۔"

جیسا کہ دنیا کے عظیم المرتبت مذاہب ہم کو سکھاتے ہیں آخر میں تو کی الاثر انسانی اعمال انسان کے اخلاقی شعور سے ہی آشکار ہوتے ہیں میں بذات خود انسان کے اخلاقی اور روحانی درجے کا ثابت قدم معتقد ہوں اور میں اپنے کلام کا اختتام ایک یورپ کے صوفی جان ڈون (JOHN DONNE) کے ان الفاظ سے کرنا چاہوں گا جن سے اس نے سترہویں صدی کے خاندان بشری کے بین الاقوامی معیار کی ترجمانی کی ہے۔ یعنی "کوئی بھی انسان مکمل طور پر جزیرہ کی حیثیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان بر اعظم کا ایک حصہ ہے اصل کا ایک ٹکڑا۔ اگر سمندر کسی روڑے کو بہالے جائے یا یورپ کو بہالے جائے اور خشکی کے کسی بلند حصہ کو بہالے جائے یا تمہارے دوستوں یا تمہارے اپنے متعلقوں کو بہالے جائے۔ کسی بھی انسان کی موت مجھ کو مختصر کرتی ہے کیونکہ میں انسانیت میں شامل ہوں اور اس لئے تم یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو کس کا ماتم ہو رہا ہے۔ درحقیقت یہ تمہارا اپنا ماتم ہے۔"

خواب برائے بنی نوع انسان

نام عمل	ملحق ممالک	تجاویز کا خاکہ
(۱) صحراؤں کو سبزہ زار بنانا	شمالی افریقی ممالک اور یورپ ریاستیں	سینائی اور جزیرہ نما عرب کے ریگستانوں کو سبز کرنا
(۲) شمسی حرارت کا کلکشن اسٹیشن		دنیا کے کسی دور دراز علاقہ میں شمسی توانائی کو اکٹھا کرنے کا ایک وسیع پیمانے کا انسٹالیشن۔ زمین پائپ لائنوں اور مزید ساز و سامان مہیا کرنے میں کوئی دو تا پانچ ملین امریکی ڈالروں کی لاگت لگے گی۔ اس کا سالانہ ماحصل کوئی بیس کھرب تیل کے پیپوں کے برابر ہوگا۔
(۳) سمندر کے دھاروں سے برقی سکت پیدا کرنا		خط استوا سے لے کر منطقہ معتدلہ تک غیر ترقی یافتہ سمندری ساحل سے منسلک ایک درجن زرخیز علاقے ہیں۔ ایک علاقہ میں تین کروڑ پچاس لاکھ کلو واٹ طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ مجموعی طور پر سارے علاقوں سے کوئی بیس کروڑ کلو واٹ طاقت پیدا کی جا سکے گی۔
(۴) ہمالیہ کے پانی سے بجلی بنانے کا منصوبہ	ہندوستان چین اور بنگلہ دیش	دریائے برہم پترا کے بالائی حصوں میں بہنے والی سانپونڈی پر، جو چین اور ہندوستان کے صوبہ آسام کے سرحدی علاقہ میں ہے ایک باندھ باندھا جائے اور جمع شدہ پانی کو ایک سرنگ کے ذریعہ ہمالیہ کے پار ہندوستان میں بہا لیا جائے اس سے زیادہ سے زیادہ پانچ کروڑ تاد اور اوسطاً تین کروڑ ستر لاکھ کلو واٹ طاقت پیدا کی جا سکے گی پورے سال میں ۲۰۴ تا ۳۰۴ کھرب کلو واٹ اور توانائی پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔
(۵) افریقہ کی وسطی جھیل	وسطی افریقی ممالک	کانگو دریا پر باندھ بنا کر اس کی روانی پر قابو پانے کے خیال سے وسطی افریقہ کے کانگو اور شاڈ کے علاقوں میں ایک وسیع جھیل وجود میں لائی جائے جس سے ان علاقوں کے قدرتی حالات کو بہتر بنایا جائے۔

ایسی قوم جس کا سارا اثاثہ علم ہے: سائنس کا علم، ٹکنالوجی کا علم، زبانوں کا علم اور پھر ایسی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا بے معنی ہی سہی لیکن اپنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گذاریں گے، اسٹرائیکیں نہیں کریں گے، فلمیں نہیں دیکھیں گے، اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے، علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے۔ شائد اس میں ہمارے لئے بھی سبق ہو سکتا ہے۔ عبد السلام

اس کے کہنے کے انداز کو دیکھئے

بی این پانڈے

عِلم کی بندگی جس کا ایمان ہے
دوسروں کی بھلائی کا ارمان ہے
خوش رہے ہر بشر اس کا فرمان ہے
جس پہ مولیٰ ہمیشہ مہربان ہے

فن سے اپنے سجایا سنوارا جسے
ایسے فنکار کا یہ ہُنر دیکھئے

ہلچلوں سے جو دُنیا کی غافل نہیں
کون سا ہے بشر اس سے واقف نہیں
جس کی ہر معاملے پہ ہے پوری پکڑ
اس کا ہے سوچنے کا سلیقہ غضب

جس نے اپنے وطن کو ہے پہچان دی
ایسے انسان کا یارو! کرم دیکھئے

اچھی تعلیم سے وہ نکھر جائے گا
ٹکنیکی عِلم سے جو سنور جائے گا
مشورہ پا کے خود کو بدل پائے گا
اِس زمانے میں وہ مُلک اُبھر پائے گا

جس کے پیغام میں رہنمائی چھپی
اس کے جذبات کا یہ اثر دیکھئے

کیسے ذرّہ بنا اہم مسئلہ تھا یہ
کون سی طاقتیں اس میں موجود ہیں!
اِن خیالوں پہ محنت سے تحقیق کی
اُن سوالوں کا حل جس میں محفوظ ہے

جس بلندی پہ پہنچا دیا عِلم کو
اس کی تحقیق کا سِلسلہ دیکھئے

طاقتوں کا وطن آج کی کھوج ہے
راز اس سے بہت سارے کُھل جائیں گے
اس نئی کھوج سے گر سبق سیکھ لیں
اپنے لوگوں کی قسمت بدل پائیں گے

جس کی آمد سے سینٹر یہ روشن ہوا
اُس کی تقریر کے بال و پر دیکھئے

اس کے دِل میں ہے خواہش یہی دَم بدم
جس کی ہو جُستجو اس کو حاصل کروں
اپنے مقصد کو انجام دوں اس طرح
اس جہاں کی میں جی جاں سے خدمت کروں

جس کے اخلاق اتنے بلندی پر ہوں
اس کے جذبات کا یہ اثر دیکھئے

لوگ خوش حال ہوں کوئی رنجش نہ ہو
اور عقیدت سے جھکنے پہ بندش نہ ہو
نیک کاموں میں کوئی رُکاوٹ نہ ہو
بات کہنے میں کوئی بناوٹ نہ ہو

صاف کہنے میں جس کو ہچک ہی نہیں
اس کے کہنے کے انداز کو دیکھئے

۱۔ انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس تریسٹے

ڈاکٹر عبدالسلام اور اُن کے بین الاقوامی سائنسی مرکز کے متعلق دلچسپ تبصرہ

(اینجل کالڈر)

۱۹۴۰ء کی گرمیوں کی ایک دوپہر میں عبدالسلام صاحب برطانوی ہندوستان کے ایک پنجابی قصبہ جھنگ میں سائیکل کے ذریعے تشریف لائے قصبے کے لوگ ان کے استقبال کی خاطر گلیوں اور سڑکوں میں صف آرا تھے کیونکہ انھوں نے چودہ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں آج تک کامیاب ہونے والے افراد میں سب سے زائد نمبر حاصل کئے تھے۔ امتحان کا یہ نتیجہ ایک قومی جذبہ تھا لیکن اس کا اثر جھنگ سے زیادہ اور کہیں نہیں تھا کیونکہ یہاں اسکول کی تعلیم کا رواج کم تھا۔

اس لمحہ سے عبدالسلام صاحب عوامی جاگیر بن گئے۔ خاندان کو ان کے تعلیمی مصارف سے سبکدوش کرنے کے لئے وظائف دئے گئے تاکہ وہ اپنی آئندہ تعلیم کو جاری رکھ سکیں جو پہلے تو پنجاب یونیورسٹی کے تحت گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی اور بعد میں انگلینڈ کی کیمبرج یونیورسٹی کے سینٹ جانس کالج میں۔

سلام صاحب کو اپنے دور کے قابل ترین افراد کو ششدر کر کے آخر کار نظریاتی طبیعیات میں ایک رہنما بننا تھا۔ آج ۶۱ برس کی عمر میں وہ ایک بین الاقوامی ملکیت ہیں۔ وہ ٹریسٹے کے بین الاقوامی نظریاتی طبیعیات کے مرکز کے ڈائرکٹر ہیں اور امریکہ کے میساچوسیٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے مماثل امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، لندن یونیورسٹی سے بہ اجازت غیر حاضری کی رخصت پر ہیں۔ وہ صدر پاکستان کے خصوصی سائنسی صلاح کار بھی ہیں اور ان چند ذی فہم افراد میں سے ایک ہیں جنھیں اقوام متحدہ کی جانب سے غریبی کے خلاف عالمی جنگ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو بروئے کار لانے کا کام سونپا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کی قدر شناسی عامہ سے کسی فرد کی ذاتیات یا علم طبیعیات میں اس کے کردار کا اندازہ بہت کم ہو پاتا ہے۔

بیشک سلام ایک مجیر العقول بچہ تھے لیکن ان کی تمام صلاحیتیں دُنیا کے ایک کونے میں دب کر رہ جاتیں۔ سلام صاحب خوش نصیب تھے کہ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس کی زہد و تقویٰ اور علم و فضل میں اپنی ذاتی روایات تھیں۔ ان کے والد ماجد اس دریائے سندھ کے جس نے ہندوستان کو ہندوستان نام بخشا، معاون دریا کے کنارے کاشتکار قوم کے ایک معمولی افسر تھے۔ روزانہ جب سلام صاحب اسکول سے گھر پہنچتے تھے تو ان کے والد دن بھر کی پڑھائی سے متعلقہ سوالات کرتے تھے اور اگر دیگر کسی حوصلہ افزائی کی ضرورت سمجھی جاتی تھی تو ان کے تایا اس میں بھرپور تعاون دیتے تھے۔

جیسے جیسے سلام صاحب کی تعلیم آگے بڑھی، مغربی علوم کے مطالعے سے ان کے اندر اسلامی روایات پسندیدگی حاصل کرتی گئیں۔ انھوں نے انگلش ادب کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی پڑھا ان کا پسندیدہ مضمون ریاضی تھا لیکن صرف ریاضی ان کو سول سروس میں جانے سے نہیں بچا سکتا تھا جو اس ملک کے اولوالعزم نوجوان کا مقدر بن چکی تھی۔ دوسری جنگ عظیم نے نئے تقررات کے لئے ایک وقفہ مہیا کر دیا تھا، اس لئے سلام صاحب ۱۹۴۶ء میں اپنی تعلیمات کی تکمیل کی خاطر کیمبرج یونیورسٹی چلے گئے۔

کیمبرج نے، خصوصاً وہاں سینٹ جانس کے پیچھے کے باغات نے انھیں مقید کر لیا۔ اس کے بعد ایک قریبی ٹرینٹی کالج کی فیلو شپ کو جو کہ برطانیہ کا ایک بہترین کالج تصور کیا جاتا تھا صرف اس لئے مسترد کرنے والے تھے کہ جمالیاتی اعتبار سے وہاں کے میدان سینٹ جانس کے مقابلے میں کم خوشنما تھے۔ وہ رینگلر کہلائے جانے لگے (جو کہ کیمبرج میں بطور رواج اس شخص کو کہتے ہیں جو ریاضی میں اول اور ممتاز مقام کا حامل ہو)

اس کے بعد سلام صاحب نے ایک عالم کائنات فریڈ ہوئل کی صلاح کو مانتے ہوئے علم طبیعیات کی مزید تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی کیونکہ ہوئل نے کہا تھا "ورنہ تم کبھی بھی تجرباتی طبیعیات میں ماہر طبیعیات کی حیثیت سے نمایاں مقام نہیں لے سکتے"۔

سلام صاحب نے طبیعیات کا کورس پڑھنے سے پرہیز زائد ہی کیا۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور کیونڈش لیب میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کرنے لگے یہ قدم ایک زبردست غلطی بن گیا ہوتا کیونکہ سلام صاحب تجرباتی کاموں میں قطعی مناسب نہیں تھے۔ وہ اپنے تجربات سے عجیب و غریب نتائج اخذ کر کے انھیں اپنی نئی تھیوری کی بُنیاد پر سمجھانے کی کوشش کرتے۔ انھوں نے کیمبرج کے نظریاتی طبیعیات کے ماہرین سے اصرار کیا کہ وہ ان کے ذوق کی تسکین کے لئے مزید کچھ مہیا کریں۔ نوعمر طالب علم کی کیا بات خود داخلہ دی اور خوش ذوقی کا تقاضہ تھا کہ وہ فطرت کی گہری خصوصیات کے بارے میں سوالات کرے۔

ایک مسلم صوفی کے عقائد کے اقتباسات اللہ کو ابدی حسن میں تلاش کیا جانا چاہئے اور سلام صاحب کے نزدیک حسن نئے، ذہین اور سہل کرنے والے اطوار کے ذریعے سے پیدا ہوتا ہے۔ کوئی شے جو اُلجھاوے پیدا کرنے والی ہو ان کے نزدیک بدنما ہے، اور انھیں جسمانی برگشتگی سے ہمکنار کر دیتی ہے اور انھیں اس کو دھونڈ لینے پر بالکل اسی طرح مجبور کر دیتی ہے جس طرح کوئی انسان کسی مقدس مزار سے کیچڑ کو صاف کرتا ہے۔

ان کا پہلا تحقیقی کارنامہ جو انھوں نے کیمبرج میں مکمل کیا علم طبیعیات میں موجود ایک لغویت سے نجات حاصل کرنا تھا۔ پہلی تھیوری کے اعتبار سے ایک الکٹرون کا چارج لامحدود ہو سکتا تھا۔ بڑی بصیرت سے جولین شونگر، رچرڈ فائنمن اور فری مین ڈائسن جیسے ماہر طبیعیات نے اس مشکل کے حل کی طرف اشارہ کیا لیکن مکمل ریاضی ثبوت موجود نہیں تھا۔ اس کی تکمیل اور فراہمی کا کام سلام صاحب نے انجام دیا۔

۱۹۴۰ء کے اواخر سے جب سلام صاحب عملی طور پر میدان میں آئے ماہرین طبیعیات مادّہ کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں توڑ چکے ہیں اور ان کی وضاحت کے لئے نئے نظریات بھی پیش کر چکے ہیں۔ تمام عظیم پیش قدمیوں میں سلام صاحب بے پناہ مصروف کار رہے۔ ان کے تین کارنامے غیر معمولی طور پر اہم ہیں جن سے نظم و ضبط کے لئے ان کی پیاس کی توضیح ہوتی ہے۔

پہلا کارنامہ پیریٹی (PARITY) سے متعلق ہے جس کے تحت فزکس کا وہ نظریہ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق ایک واقعے اور اس کی شبیہ میں مماثلت سے ہے۔ جب کوئی تابکار ایٹم الکٹرون (بیٹا کرنیں) خارج کرتا ہے تو اس کے ساتھ وہ ایک بہت ہی مغالطے میں ڈالنے والے حیران کن ذرات جنھیں نیوٹرینو کہا جاتا ہے بھی خارج کرتا ہے۔ دونوں ذرات اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے بڑھتے ہیں اور فطری خیال یہ تھا کہ دونوں ذرات کا بائیں رُخ سے یا دائیں رُخ سے گردش کرنے کا امکان برابر تھا۔ سیٹل میں ۱۹۵۶ء میں ہوئی کانفرنس میں ایک چین میں پیدا ہوئے امریکن سنگ داؤلی اور چین ننگ یانگ نے بتایا کہ یہ دائیں اور بائیں سمت والی پیریٹی کی بات امکانی نہیں ہے۔

یہ چونکا دینے والی تجویز جس نے تیس سال پُرانے پیریٹی کے تحفظ کے اصول کو للکار دیا تھا سلام صاحب کے سیٹل کانفرنس سے انگلینڈ جاتے ہوئے ذہن سے چپک کر رہ گئی۔ اگر پیریٹی کے عدم تحفظ کا بدنما اصول قابل برداشت تھا تو اس کی وضاحت بہت خوب صورت انداز میں ہونی چاہئے تھی انھوں نے سوچا کہ اس بات کی تسلی بخش وضاحت کوئی بھی نہیں کر سکا تھا کہ نیوٹرینو کی کمیت (MASS) نہیں ہوتی۔ کمیت سے ہمارا مطلب ہے کہ کوئی ذرّہ اپنے ہی میدان سے تفاعل کر کے سرعت کی مخالفت کرے گا۔ اور کمیت سے ہمارا یہی مُدعا ہے۔ سلام صاحب نے دیکھا کہ اگر نیوٹرینو ایک ہی سمت میں چکر کاٹتا ہے تو فطری اعتبار سے یہ انجام چکمہ کھا سکتا ہے، بہ الفاظ دیگر اگر پیریٹی کی خلاف ورزی ہو۔

یا وہ صحیح الفاظ میں پیریٹی کی خلاف ورزی کو پیریٹی کے اصول کو پوری طرح متوازن رکھنا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نیوٹرینوں کے ساتھ نکلے اوسطاً تین الکٹرون ایک سمت چکر کاٹیں گے اور دوسرے دوسری سمت میں۔ جس وقت تک اُن کا جہاز انگلینڈ میں اُترا ان کے ذہن میں پورا خاکہ بن چکا تھا۔ مخصوص ساتھیوں نے ان کے نظریے کا مذاق اُڑایا۔ ۱۹۵۷ء میں تین شیونگ دونے کوبالٹ۔ ۶۰ پر کئے گئے اس تجربے کا جشن منایا جس نے پیریٹی کی خلاف ورزی کے اصول کو ثابت کیا تھا۔ آسٹریا کے ماہر طبیعیات ولف گینگ پالی نے یہ بتایا کہ ہر تین بائیں سمت چکر کاٹنے والے الکٹرون کے لئے ایک الیکٹرون دائیں سمت چکر کاٹتا ہے اور یہ بات بالکل سلام صاحب کے نظریات کے مُطابق تھی۔

لیکن سلام صاحب دیگر ماہرین طبیعیات کی مانند اُونچا کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔ کیا یہ تین کون ذرات بنیادی ذرات ہو سکتے ہیں؟ یا کچھ ذرات دوسرے ذرات کے مقابلے میں زیادہ بنیادی ہوتے ہیں؟ سب سے اچھی ترکیب تھی خاندانی گروہ بندی کی جُستجو جس سے یہ بات کہی جاسکے کہ اگر ایک پارٹکل کا وجود ہے تو اس کے دوسرے ذرات بھی انھیں خاندانی اوصاف کے ساتھ موجود ہونے چاہئیں ایسے خاندانی اوصاف جو اس کے اوصاف کے مماثل تو ہوں لیکن ہوبہو وہی نہ ہوں۔

۱۹۶۰ء میں اس کا راستہ ہموار ہوا جب ناگویہ یونیورسٹی کے یوشیو اوہنکی نے جاپان میں یونٹری سمٹری (UNITARY SYMMETRY) کا نظریہ پیش کیا جس کے ذرات کے درمیان موجودگی کے امکانات تھے۔ اس کا آغاز اس خیال سے ہوا کہ اکثر ذرات تین اشیاء سے بنے ہیں جو کہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ سلام پہلے غیر جاپانی ماہر طبیعیات ہیں جنھوں نے غالباً مشرقی دماغوں کی ہمدردی میں اس نظریہ کو تسلیم کیا۔ اس طرح امپیریل کالج جہاں سلام صاحب نظریاتی طبیعیات کے پروفیسر تھے یونٹری سمٹری کے نشو و نما کا مرکز بن گیا۔

سلام صاحب اور امپیریل کالج آنے والے ایک ملاقاتی جان وارڈ نے ۱۹۶۱ء میں ایسے آٹھ ذرات والے نئے کُنبہ کی پیش گوئی کے سلسلے میں اس کو استعمال کیا ہے جن کا اسپن پروٹون کے اسپن کا دُگنا ہے اور جو تقریباً چھ ماہ پیشتر تلاش ہوئے تھے۔ سلام صاحب کے ساتھ کام کرنے والے یوول نام کے ایک اسرائیلی تحقیق کار طالب علم نے یہ بتایا ہے کہ بھاری ذرات جن میں پروٹون اور نیوٹرون بھی شامل ہیں آٹھ ممبری خاندان بناتے ہیں۔ ان ہی دنوں میں کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے مرے گیل مین بھی اسی نتیجہ پر پہنچے تھے۔ انھوں نے سمٹری کے نظریہ کا استعمال ایک بہت ہی حیرت انگیز پارٹکل کی پیش گوئی میں کیا جسے اومیگا مائنس کہا گیا اور جب ۱۹۶۴ء کے اوائل میں یہ سب ہو گیا تو سمٹری نظریات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئے۔

دوسری بڑی پیش قدمی امریکی ماہرین نظریات کی جانب سے ہوئی جنھوں نے یونٹری سمٹری کے نظریے کا استعمال بھاری ذرات کے مُختلف خاندانوں کو ۵۶ ذرّات کے ایک ہی سلسلے سے منسلک کرنے میں کیا۔ لیکن اس نظریے نے نظریۂ اضافیت (RELATIVITY) کو یکسر نظر انداز کر دیا جو کہ بے پناہ اہم نظریہ ہے اور اس کی نظر اندازی نے سلام صاحب کو اپنے تیسرے سائنسی کارنامے کی تکمیل پر مائل کر دیا۔ اس مرتبہ اپنے "ہمراہیوں رابرٹ ڈیلبورگو اور جان استھریڈی کے ساتھ کام کر کے آئنسٹائن کے چہار بعد (FOUR DIMENSIONS) (تین بعد خلا کے اور ایک وقت کا) کا استعمال مزید نقوش کے حصول کی خاطر کیا۔ سلام صاحب نے اس وقت رائے زنی کی تھی "ہم کو کسی اور نئے پارٹکل کی ایجاد پر کوئی حیرت نہیں ہوگی"۔ اس سے پہلے نظریے میں جس کے تحت اومیگا مائنس کی ایجاد ہوئی تھی کچھ خامیاں تھیں اور یہ خامیاں نئے نظریے میں بھی برقرار رہیں جس کا اشارہ ان کے ساتھیوں نے کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نظریے کے جائز اور معقول حصے نے ذرّاتی طبیعیات میں بلند تر نقوش ہموار کئے ہیں۔ جیسا کہ سلام صاحب فرماتے ہیں۔ "اب تو ہماری فہرست ہی ختم ہو گئی"۔

مُسلم ساتھیوں کے خیال میں سلام صاحب کے لئے علم طبیعیات عبادت کی طرح ہے لیکن وہ طبیعیات کو ایک بڑی تفریح کے طور پر بھی لیتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں کسی مسئلے کو اس طرح جکڑتے ہیں جیسے ایک کُتا ہڈی کو جھنجھوڑتا ہے۔ تب بھی وہ پُرسکون رہتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں سے مباحثے کے دوران وہ خیالات کا دریا سا بہا دیتے ہیں۔ اتفاق سے اگر سلام صاحب صحیح نکلتے ہیں تو ان کا فاتحانہ انداز میں یہ کہنا "کہ میں نے آپ سے پہلے ہی یہ کہا تھا" کسی ایسے شخص کو برہم کر دینے کے لئے کافی ہو سکتا ہے جسے ۹۹ ایسی مثالیں یاد ہوں جن میں اتنی ہی خود اعتمادی سے سلام صاحب نے اظہار رائے کیا تھا اور وہ سب کے سب غلط تھے۔

ان کے نظریات میں پائے جانے والے احساس اور مزاج کی شدت اس وقت واضح ہوئے جب ایک بار وہ بیمار پڑے۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں اب علم طبیعیات کی بات نہیں کر سکتا کیونکہ میں تم پر چلّا نہیں سکتا"۔ عموماً سلام صاحب پُرسکون انداز میں سنجیدگی اور نہایت روانی کے ساتھ دھیمی زبان میں بات کرتے ہیں جس میں قہقہے بھی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ نظریات میں ہمیشہ مثبت رویہ اپناتے ہیں۔ وہ شاکی ہیں کہ کچھ ماہرین نظریات مذہب کے منکر ہیں۔ وہ غلط نظریات کی خامیاں اُجاگر کرنے میں بڑا ملکہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ ان کا کوئی نعم البدل پیش نہیں کر پاتے، میں تعمیر پسند کرتا ہوں"۔ وہ لگاتار قدرت کے نمونوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی توضیح ریاضی کی بُنیاد پر کی جائے تاکہ ان میں حُسن اور نظم و ضبط پیدا ہو سکے۔ ان کا کہنا ہے "ایک مجروح ہم آہنگی ان کو بھی مجروح کر دیتی ہے"۔ وہ ایک کہاوت کے عاقل شخص کی مانند صبح پانچ بجے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں اور جلدی ہی بستر پر چلے جاتے ہیں۔

ایک طرف ایک ذہین پنجابی لڑکے کی کہانی ہے جو ایک غیر معمولی ماہر طبیعیات بن گیا۔ لیکن ایک دوسرا سلام ہے جو جدید ترین معنوں میں پوری دُنیا کا فرد ہے۔ ایک ایسا فرد جو سائنسی تنظیم اور سیاست اور اپنے وطن اور تقریباً آدھی دُنیا کے افلاس اور پستی کے خوفناک مسائل سے اُلجھا ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب سلام صاحب کیمبرج کی انجان دُنیا میں اپنا مقام تلاش کر رہے تھے، حکومت برطانیہ نے ہندوستان پر اپنی حکومت ختم کر دی اور ایک مُسلم مُلک پاکستان عالم وجود میں آیا۔ چار برس بعد پچیس سال کی عمر میں سلام صاحب واپس لاہور گئے۔ وہاں انھوں نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک گورنمنٹ کالج میں ریاضی کے اُستاد کی حیثیت سے کام کیا اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک پنجاب یونیورسٹی میں ریاضی کے صدر شعبہ بھی رہے۔ وطن واپس آکر اپنے لوگوں کو ہی پڑھانا انھوں نے اپنا فرض سمجھا۔ یہ قدم بڑا نحس ثابت ہوا اگرچہ سلام صاحب نے بہ آسانی اسے ترک نہیں کیا۔ پیشہ ورانہ مایوسی کے باعث واپس انگلینڈ جانے سے پہلے انھوں نے تین برس وہاں آلام و مصائب کی زندگی گزاری۔ بڑی بے دلی سے وہ ترک وطن کے لئے تیار ہوئے کہ وہ ترک وطن جس نے ایشیاء کی وہ تمام ذہانت لوٹ لی ہے جس کی اس کو اشد ضرورت ہے۔ لیکن انھوں نے وہی کرنے کا فیصلہ کیا جس سے وہ دیگر ملکی نوجوانوں کو پیشہ اور مادر وطن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کی بے رحم روایت سے بچا سکیں۔

لاہور میں سہولتوں کی کمی کے لئے وہ ہرگز پریشان نہیں تھے کیونکہ ایک ماہر نظریات تو سادہ کاغذ اور بلیک بورڈ پر کام کر سکتا ہے لیکن لاہور میں تعلیمی ماحول خراب تھا۔ سائنس کو نہ صرف نئی قوم کے ذہین رہنما نظر انداز کرتے تھے بلکہ ذہین طلباء بھی سائنس کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ سلام صاحب ذہنی طور پر اکیلے تھے۔ وہ علم کائنات اور سپر کنڈکٹرز کی تھیوری میں بیکار ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ان کا کہنا ہے "آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ دوسرے ماہرین طبیعیات کیا کر رہے ہیں اور آپ کو ان سے رابطہ رکھنا پڑے گا"۔ "میں خوفزدہ تھا کہ اگر میں لاہور میں رُکا تو میرا کام زوال کی طرف مائل ہو جائے گا۔ تو میں اپنے ملک کے کس کام آسکوں گا؟" "لاہور میں پروفیسر ہونے سے بہتر ہے کہ کیمبرج میں لیکچرار بن جاؤں۔"

سلام صاحب نے پھر اپنی راہ پکڑ لی۔ اور ان کو فوری کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ جنیوا، سوئٹزرلینڈ میں ۱۹۵۵ء میں ہوئی ایٹم فار پیس کانفرنس (ATOMS FOR PEACE CONFERENCE) جو اقوام متحدہ نے منعقد کی تھی کے سائنس سکریٹری کے فرائض انجام دینے کے لئے بُلائے گئے۔ بہت سے دوسرے افراد کی مانند سلام صاحب بھی اس بے نظیر اور مشہور موقعے پر بہت جذباتی تھے کہ یہ کانفرنس تمام انسانوں کے مفاد کی خاطر دُنیا کی سائنس اور تمام قوتوں کا استعمال کرنے کے لئے منعقد کی جا رہی تھی۔ دو برس بعد ان کا انتخاب امپیریل کالج میں نظریاتی فزکس کے ایک ادارے کی داغ بیل ڈالنے کے سلسلے میں کیا گیا۔ وہ برطانیہ کی سب سے چنیدہ سائنس دانوں کی انجمن رائل سوسائٹی کے سب سے نوعمر فیلو بھی منتخب ہوئے۔

آج سلام صاحب ٹریسٹے میں قائم شدہ نظریاتی طبیعیات کے اپنے بین الاقوامی مرکز کے ڈائرکٹر ہیں۔ یہاں مضاف الیہ "اپنے" کا استعمال بالکل مناسب ہے۔ سلام صاحب ہی نے اس مرکز کو اس انداز میں تصوّر کیا تھا جہاں تمام ممالک سے آکر لوگ ذہین اور غیر معمولی افراد کے ساتھ کام کر سکیں۔ پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے انھوں نے اس مرکز کی تخلیق کی تجویز بین الاقوامی ایٹامک انرجی ایجنسی کے رُوبرو ۱۹۶۰ء میں رکھی اور ۱۹۶۴ء میں وہ خود ہی اس کے پہلے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ شروع میں ترقی یافتہ ممالک جیسے فرانس، برطانیہ، رُوس اور امریکہ اس مرکز کے سلسلے میں کافی سرد مہری کا ثبوت دیتے رہے لیکن وہ ترقی پذیر ممالک سے ملنے والی اس گرم جوش حمایت کی مخالفت نہ کر سکے جو سلام صاحب کی پُشت پناہی کر رہی تھی۔ اٹلی کی حکومت نے مرکز کی پہلے چار سال کی امداد کے لئے سب سے بڑی پیش کش کی، عارضی طور پر عمارت دی اور میرامارے کی ساحلی تفریح گاہ پر نئی عمارت کا کام شروع کر دیا۔

سب سے بڑی پیش کش جس نے مرکز کو سائنس کے میدان میں مستحکم کیا اور دُنیا کے ماہرین طبیعیات کی نظر میں اس کو مقناطیسی حیثیت عطا کی، وہ تھے عبدالسلام صاحب کے عزائم جو انھوں نے ڈیل بورگو اور استراتھڈی کے ساتھ مل کر یونٹری سمٹری کے نظریات کو عام کرنے میں کئے۔ ۱۹۶۴ء میں مرکز کے قیام کے کچھ ہی ماہ بعد اس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

یہ مرکز جسے سلام صاحب اقوام مُتحدہ کی یونیورسٹی کے اوّلین شعبے کی شکل میں دیکھتے ہیں، مشرق و مغرب کے نظریاتی ماہرین کے ملنے کا بہترین مقام مہیا کرتا ہے۔ مثلاً ۱۹۶۵ء میں سلام صاحب نے ایک سال چلنے والے اجلاس کا انعقاد کیا جس کا مقصد ہائیڈروجن بم پر قابو پا کر اس سے نکلی ہوئی گرم گیسوں سے مُفید توانائی پیدا کرنا تھا۔ ایک امریکی مارشل روزن بلتھ اور ایک رُوسی رولول سیگدیو کی صدارت میں ہوئے اجلاس کا نتیجہ بین الاقوامی پالیسی کے تحت اس تجرباتی عمل کی صورت میں رونما ہوا جس کا مقصد نوع انسانی کو توانائی کے لامحدود ذخیرہ کا راستہ بتانا تھا۔

سلام صاحب کے دِل کے سب سے قریب اس مرکز کا کردار یہ ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک میں کام کرنے والے افراد کی تنہائی کو دُور کیا جائے تاکہ آئندہ کوئی نظریاتی ماہر اس تنہائی کا شکار نہ ہو سکے جو خود سلام صاحب کو لاہور واپس لَوٹنے پر بھگتنی پڑی تھی۔ افریقہ، ایشیاء اور لیٹن امریکہ سے پروفیسر اور طلباء یہاں کچھ ہفتے یا ماہ گزارنے آتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے مضمون کی بڑی بین الاقوامی اور اہم ترین شخصیات سے بے تکلفی سے ملتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کی ایجاد کردہ ایک تدبیر دوسرے اداروں نے بھی اپنائی ہے اور فورڈ فاؤنڈیشن کی مخصوص حمایت اسے حاصل ہو گئی ہے۔ اور وہ ہے ایسوسیئیٹ مُقرر تجویز (ASSOCIATESHIP) جس کے تحت منتخب نظریاتی ماہرین ہر سال تین ماہ کے لئے مرکز کے اخراجات پر مرکز میں آکر رہنے کا امتیازی حق رکھتے ہیں۔

موسم سرما وہ دور ہے جب جنوب کے نظریاتی ماہرین طبیعیات اپنی یونیورسٹی کی گرمیوں کی تعطیلات گذارنے یہاں آتے ہیں۔ سائنسدانوں کے لئے یہ موقعہ اپنے قرابت داروں سے اپنے تعلقات کی تجدید کا موقعہ ہوتا ہے۔ چار برس تک ہیٹی کو یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد ساوید ایک بچھڑے ہوئے یموکی مانند ہو گئے۔ وہ لندن میں ملازمت کرنے پر مائل ہو گئے لیکن اسی دوران ٹریسٹے میں کھلے اس مرکز نے انھیں برین ڈرین (BRAIN DRAIN) کی حرکت کا معاون ہونے سے بچا لیا۔ مشرقی یورپین کے لئے ٹریسٹے تمام باتوں سے بالاتر ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے درمیان مؤثر اشتراک کے لئے یہ مرکز بہترین مقام ہے۔ سلام صاحب کبھی مُطمئن ہیں کہ مرکز کے توسّل سے افریقی نظریاتی طبیعیات کے ماہرین کبھی اس مضمون کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے لگے ہیں۔

سلام صاحب ٹریسٹے کے باشندے پاؤلو بدینی کی ہمراہی میں اس مرکز کی صدارت بڑی فیض رسانی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ یہ بات کچھ ہی لوگ جانتے ہیں کہ مرکز کی بقا کے لئے سلام صاحب کس قدر جدوجہد کر رہے ہیں اور کس قدر جدوجہد کر چکے ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۷ء میں وہ درات کی کارٹی سے آئی اے ای اے کے گورنروں سے یہ بات کرنے دیا نہ گئے کہ اس مرکز کو دائمی کر دیا جائے۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنی خفگی کو بھی نہیں چھپایا۔ پُرانے دور میں ایک مُسلم مجاہد اپنی تلوار کھینچ لیتا تھا آج سلام صاحب اپنے الفاظ کو بے نیام کر لیتے ہیں۔ وہ اسلامی روایات کی تائید کرتے ہیں کہ ضبط ایک حد تک ہی کیا جا سکتا ہے، شریفانہ ترغیب ایک حد تک ہی آزمائی جا سکتی ہے اگر آپ کسی مزید بلند مقصد کے لئے جھگڑ رہے ہیں۔

عبدالسلام کے لفظی معنی ہیں امن کا غلام۔ ٹریسٹے مرکز کی ٹوٹی پھوٹی انگلش اور پیچیدہ ریاضی کے توسّل سے عبدالسلام صاحب کے کشادہ اور سادہ اظہار کی شکل میں جو وہ اقوام مُتحدہ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صلاح کار کمیٹی کے لئے کر رہے ہیں ایک تصوراتی بھائی چارہ نشو و نما پا رہا ہے۔ اقوام مُتحدہ کے مراکز پر وہ اپنے سترہ دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ہر سال دو مرتبہ دس دن گزارتے ہیں۔ ان مراکز میں جنیوا، سوئٹزرلینڈ، نیویارک، پیرس، فرانس، روم اور اٹلی قابل ذکر ہیں۔

وہ ان راہوں کا تعین کرتے ہیں جن پر گامزن ہو کر سائنس اور ٹیکنالوجی کی صلاحیتیں اس آدھی دُنیا کی ترقی کو تیز تر کر سکیں جو افلاس کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔

اقوام مُتحدہ کمیٹی نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی پذیر ممالک میں نشو و نما دینے کے لئے اور تکنیکی صلاحیتوں کو ان ممالک میں منتقل کرنے کے لئے جن کو اپنے مایوس کن حالات میں واقعی ان کی ضرورت ہے ایک عالمی تجویز تیار کی ہے زمانے کے عقلاء نے کچھ تکنیکوں جیسے کھارے پن کو دُور کرنا اور بیماری پھیلانے والے کیڑوں کو ختم کرنا وغیرہ کی ترقی کے لئے بھی جلد از جلد عمل درآمد کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ہر ممبر کی کچھ اپنی ذاتی مصروفیات اور ولولے ہوتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کی دلچسپی خاص طور پر ترقی یافتہ ممالک کے سائنسدانوں کو عالمی ترقی کے کام میں مشغول کرنے میں ہے۔

اپنے مُلک پاکستان کی جانب سے ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ٹھیک ایسا ہی کیا۔ برطانوی دور میں سندھ گھاٹی میں بنے آبپاشی کے پلانٹ میں خرابی آگئی تھی، کئی برسوں تک آبپاشی کرنے والی نہروں سے رسن کے باعث کاشت کے تمام میدان سیم زدہ ہو گئے، جبکہ پانی کے بھاپ بن کر اُڑنے کے باعث نمک جمع ہو گیا تھا۔ جب سلام صاحب نے ان حالات کا تذکرہ کیا تو امریکی سرکار نے کچھ مایہ ناز سائنس دان، ماہرین زراعت اور انجینئر مغربی پاکستان بھیجے۔ امریکہ کے امور داخلہ کے سکریٹری کے سائنسی صلاح کار اور کیلی فورنیا میں لاجولا کے اسکرپ انسٹی ٹیوشن آف اوشنوگرافی کے منتظم روجر ریولے کی سرکردگی میں آنے والی اس ٹیم نے مکمل معائنے کے بعد پمپ اور کنوؤں کا ایک ایسا پلان تیار کیا جس سے زمین سے پانی نکال کر نمک کو صاف کیا جا سکے۔ مغربی لاہور میں لاکھوں ایکڑ زمین کامیابی کے ساتھ اسی تدبیر کے ذریعے درست کی جا رہی ہے۔ تقریباً تیس ہزار سے زائد کسانوں نے یہ طریقہ اپنایا ہے اور اس طرح مغربی پاکستان میں پیداوار میں اضافہ کیا ہے۔

صدر ایوب خاں نے ۱۹۶۱ء میں اپنے سائنسی صلاح کار کی حیثیت سے سلام صاحب کا تقرر کیا اور ان کے درمیان ایک بہت قریبی اور بے تکلف رشتہ قائم ہو گیا۔ سلام صاحب پاکستان میں انسانی مزاحمت کے سلسلے میں بہت صاف گو ہیں، جیسے کہ بہت سے ترقی پذیر ممالک جہاں سائنسدان تعمیری مشورے دے سکتے ہیں لیکن حاکموں کے ذریعے انھیں نظر انداز کئے جانے کے باعث یا وسائل کی کمی کے سبب عمل درآمد نہ ہونے کے باعث منہ نہیں کھولتے۔ سلام صاحب کے سب سے طاقتور دوست ہیں، پاکستانی ایٹمی انرجی کمیشن کے چیئرمین عشرت عثمانی صاحب۔ یہ کمیشن نیوکلیئر پاور کے معاملے میں اپنے بنیادی کردار سے آگے بڑھ گیا ہے۔ یہ کمیشن پاکستانی سائنسدانوں میں عام عمدگی کی حوصلہ افزائی کے لئے ہر دم کوشاں رہتا ہے۔

عثمانی صاحب کے الفاظ میں "پاکستان میں زیادہ تر سائنسی اقدام سلام صاحب کے تصوّرات اور ان کی شخصیت کے وزن کے سبب ہیں۔ سلام صاحب سائنسی دُنیا میں ہمارے ملک کی آن اور فخر کی علامت ہیں"۔

اس کے ساتھ ہی سلام صاحب اس کا اقرار کرتے ہیں کہ خوراک اور زراعت پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور وہ قابل فہم حد تک قنوطیت کی طرف مائل ہیں۔ مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے "اب سے بیس سال بعد بھی کم ترقی یافتہ ممالک اتنے ہی بھوکے اور نسبتاً اتنے ہی مُفلس ہوں گے جتنے کہ

باقی صفحہ ۱۹ پر

Science Year : The World Book Science Annual (1987).

ڈاکٹر عبد السلام کے قائم کردہ بین الاقوامی سائنسی مرکز سی۔ائی۔ٹی۔پی سے فیضیاب ہونیوالے

تیسری دنیا کے ممالک کے سائنسدانوں کا تفصیلی گوشوارہ!

ذیل میں محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم و مغفور کے قائم کردہ بین الاقوامی سائنسی ادارہ سی۔ائی۔ٹی۔پی میں علم کا فیض حاصل کرنے والے تیسری دنیا کے ممالک کے سائنسدانوں کا ایک تفصیلی گوشوارہ دیا جارہا ہے۔ اس کے مطابق ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۵ء کے پندرہ سالوں میں اس ادارہ نے ۱۰۷ ممالک کے ۱۷۰ ماہر سائنسدان تیار کئے۔ (ادارہ)

Table of Visits to Trieste which are Indicative of the Size of Physics Communities and of the Size of High-Level Physics in Developing Countries

Table 1

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated Institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
1. Argentina	300	6	11 / 16[3]	3	169 / 212	28.4	2,070
2. Brazil	401	7	15 / 20	3	180 / 232	126.8	2,240
3. China[4]	300	34	20 / 34	19	208 / 427	1,008.2	300
4. India	1,286	30	48 / 188	12	688 / 1,562	716.9	260
5. Korea Rep.	114	3	6 / 3	2	37 / 40	39.5	1,910
Total:	2,401	80	100 / 261	39	1,282 / 2,473	1919.8	

Table 2

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
1. Egypt	691	5	16 / 49	22	243 / 453	44.3	670
2. Bangladesh	206	3	15 / 25	4	118 / 216	92.8	140
3. Malaysia	113	1	14 / 3	1	66 / 130	14.5	1,870
4. Pakistan	418	10	23 / 20	6	185 / 289	87.1	380
5. Singapore	40	2	2 / 2	–	11 / 16	2.4	5,980
6. Turkey	384	9	12 / 20	11	177 / 274	46.4	1,360
7. Mexico	197	3	3 / 8	3	58 / 93	73.1	2,740
8. Venezuela	104	1	1 / 3	–	32 / 47	16.6	4,140
Total:	2,153	34	86 / 130	47	890 / 1,518	377	

Table 3

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated Institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
1. Algeria	105	–	4 / 1	2	55 / 85	19.9	2,350
2. Ghana	142	4	5 / 6	3	82 / 133	12.1	340
3. Kenya	47	–	4 / 6	–	27 / 55	18.1	390
4. Morocco	89	–	5 / 2	2	53 / 62	20.2	860
5. Nigeria	307	13	21 / 35	11	168 / 257	90.5	850
6. Sudan	195	–	6 / 3	2	115 / 132	20.1	430
7. Tanzani	47	3	3 / 2	–	25 / 34	19.7	270
8. Iran	182	12	8 / 10	8	90 / 165	41.2	n.a.
9. Iraq	100	–	2 / 1	1	39 / 53	14.1	n.a.
10. Jordan	95	–	5 / 1	3	29 / 32	3.1	1,690
11. Kuwait	92	–	– / –	2	47 / 46	1.5	19,610
12. Lebanon	98	3	3 / 1	2	24 / 19	2.6	n.a.
13. Libya	98	–	– / 5	3	74 / 81	3.2	8,430
14. Saudi Arabia	60	2	6 / 7	2	15 / 26	10.0	15,820
15. Syria	67	–	2 / 2	4	27 / 34	9.4	1,680
Subtotal:	1,657	37	74 / 82	45	870 / 1,214	285.1	

Table 3 – contd.

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
Subtotal:	1,657	37	74 / 82	45	870 / 1,214	285.1	
16. Korea P.D.R.	1		– / –	–	– / 3	18.7	n.a.
17. Philippines	68	2	5 / 5	1	46 / 85	50.7	820
18. Sri Lanka	136	2	8 / 7	–	78 / 136	15.1	320
19. Thailand	113	–	3 / 2	4	80 / 140	48.5	790
20. Vietnam	21	–	2 / –	1	14 / 17	57.0	n.a.
21. Indonesia	132	1	3 / 3	–	79 / 134	152.5	580
22. Fiji	1	–	1 / –	–	1 / 4	0.6	1,960
23. Chile	89	4	3 / 5	1	44 / 61	11.4	2,190
24. Colombia	121	2	5 / 3	–	81 / 118	26.9	1,420
25. Peru	104	–	7 / 8	–	68 / 153	17.4	1,260
Total:	2,509	48	111 / 115	52	1,361 / 2,065	684.5	

Table 4

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
1. Benin	28	–	3 / 2	–	15 / 20	3.6	330
2. Burkina Faso	11	–	1 / 1	–	2 / 2	6.4	210
3. Cameroon	28	–	– / –	–	15 / 13	9.2	880
4. Congo	10	–	– / 1	–	6 / 12	1.7	1,370
5. Côte d'Ivoire	12	–	– / –	–	8 / 9	8.9	910
6. Ethiopia	26	–	2 / 2	1	23 / 23	32.9	140
7. Madagascar	35	2	1 / 1	1	18 / 22	9.1	320
8. Mali	34	–	2 / 2	1	15 / 21	7.0	170
9. Mauritius	14	–	– / –	–	5 / 12	0.9	1,230
10. Niger	8	–	– / –	–	1 / 2	5.8	300
11. Rwanda	11	–	– / –	1	8 / 13	5.5	260
12. Senegal	43	–	3 / –	–	19 / 32	6.0	490
13. Sierra Leone	51	–	2 / –	–	19 / 25	3.1	390
14. Togo	23	1	2 / –	–	10 / 10	2.7	350
15. Tunisia	53	–	1 / 2	4	31 / 33	6.6	1,380
Subtotal:	387	3	17 / 11	8	195 / 249	109.4	

Table 4 (contd.)

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
Subtotal:	387	3	17 / 11	8	195 / 249	109.4	
16. Uganda	29	–	2 / 2	–	14 / 20	13.4	240
17. Zaire	29	–	2 / 1	–	12 / 31	30.6	180
18. Zambia	17	–	1 / 6	2	9 / 18	6.0	640
19. Afghanistan	11	–	– / –	–	4 / 4	16.7	n.a.
20. Burma	6	–	– / –	–	1 / 1	34.8	190
21. Hong Kong	19	–	– / –	–	3 / 8	5.2	6,150
22. Nepal	70	–	3 / 6	1	70 / 140	15.4	170
23. Qatar	11	–	1 / –	1	10 / 11	0.2	22,060
24. Yemen A.R.	35	–	2 / 3	1	13 / 16	7.4	500
25. Papua New Guinea	10	–	– / –	–	3 / 6	3.1	830
26. Cuba	11	–	3 / 2	1	10 / 14	9.7	n.a.
27. Honduras	8	–	– / –	–	2 / 3	3.9	660
28. Costa Rica	38	–	3 / –	–	25 / 39	2.3	1,150
29. Ecuador	11	–	1 / –	1	6 / 10	7.9	1,610
30. Guyana	9	–	– / –	–	– / 1	0.7	590
31. Bolivia	27	–	– / –	–	12 / 22	5.8	610
Total:	728	3	39 / 34	15	389 / 593	272.5	

Table 5

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
1. Angola	2	–	– / –	–	1 / 1	7.9	n.a.
2. Botswana	3	–	1 / –	–	– / 1	0.9	590
3. Burundi	10	3	2 / 2	1	11 / 15	4.3	240
4. Cape Verde	1	–	– / –	–	1 / 2	0.3	370
5. Central African R.	3	–	– / –	–	– / 1	2.4	310
6. Gabon	4	–	– / –	–	1 / 1	0.7	4,840
7. Gambia	2	–	– / –	–	2 / 3	0.7	360
8. Guinea	14	–	– / –	2	13 / 32	[illegible]	300
9. Lesotho	7	2	1 / –	–	6 / 4	1.4	510
10. Liberia	3	–	– / 1	1	4 / 7	2.0	490
11. Malawi	8	–	– / –	–	7 / 12	6.4	210
12. Mauritania	5	–	– / –	1	3 / 1	1.6	480
13. Mozambique	1	–	– / –	–	– / –	12.9	n.a.
14. Somalia	6	–	– / –	–	7 / 10	4.5	290
15. Swaziland	3	–	– / –	–	1 / 1	0.6	930
16. Zimbabwe	2	–	1 / 1	–	1 / 3	7.4	850
Subtotal:	74	5	5 / 4	5	58 / 94	65.1	

Table 5 (contd.)

	Visits 1970–1985	Post-Docs & long-term scientists 1980–1985	Associates '86/ outstanding applications	Federated institutes 1986	Applications accepted/appls. received Jan. 81 – Dec. 85[2]	Population (million)[1]	GNP/ capita (US$)[1]
Subtotal:	74	5	5 / 4	5	58 / 94	65.1	
17. Bahrain	3	–	1 / 1	–	2 / 4	0.4	9,860
18. Mongolia	1	–	/	1	1 / 1	1.7	n.a.
19. U.A. Emirates	1	–	– / –	–	1 / 1	1.1	24,080
20. West Bank	7	–	2 / –	1	6 / 8	n.a.	n.a.
21. Yemen P.D.R.	3	–	– / –	–	5 / 5	1.9	470
22. Barbados	2	–	– / –	–	1 / –	0.2	3,830
23. Dominican R.	6	–	– / –	–	5 / 7	5.7	1,610
24. El Salvador	4	–	– / –	–	1 / 5	5.0	700
25. Guatemala	2	–	– / –	–	1 / 4	7.7	1,130
26. Jamaica	7	–	1 /	–	3 / 4	2.2	1,240
27. Nicaragua	1	–	– / –	–	– / –	2.8	860
28. Panama	1	–	– / –	–	– / 2	1.9	2,120
29. Trinidad	3	–	– / –	–	– / 1	1.1	6,920
30. Paraguay	1	–	– / –	–	– / –	3.1	1,570
31. Puerto Rico	7	–	2 / 1	–	7 / 9	3.2	3,720
32. Uruguay	5	–	– / –	–	5 / 6	2.9	3,400
Total:	128	5	11 / 6	8	95 / 151	106.0	

[1] Excerpted from: 1985 World Bank Atlas. Population and GNP figures are those for 1982.
[2] For main training-for-research activities only.
[3] Plus 6 group-Associates.

ڈاکٹر عبدالسلام ۔ مصروف زندگی اور عظیم کامیابیوں کی ایک مختصر جھلک

1. ABDUS SALAM

Date of birth : 29 January, 1926
Place of birth : Jhang, Punjab
Nationality : Pakistani

2. Educational Career

Government College, Jhang and Lahore (1938—1946) — M.A. (Punjab University)
Foundation Scholar, St. John's College, Cambridge (1946—1949) — B.A. Honours Double first in Mathematics (Wrangler) and Physics
Cavendish Laboratoty, Cambridge (1952) — Ph.D. in Theoretical Physics
Awarded Smith's Prize by the University of Cambridge for the most outstanding *Pre-doctoral* contribution to physics (1950)

3. Appointments

Professor, Government College and Head of the Mathematics Department of Panjab University (Lahore) (1951—1954)
Lecturer, Cambridge University (Cambridge) (1954—1956)
Professor of Theoretical Physics, London University, Imperial College (London) (1957—)
Founder and Director, International Centre for Theoretical Physics (Trieste) (1964—)

Elected Fellow, St. John's College (Cambridge) (1951—1956)
Member, Institute of Advanced Study (Princeton) (1951)
Elected, Honorary Life Fellow, St. John's College (Cambridge) (1971—)

4. United Nations Assignments

Scientific Secretary, Geneva Conferences on Peaceful Uses of Atomic Energy (1955 and 1958)
Elected Member of the Board of Governors, IAEA, Vienna (1962—1963)
Member, United Nations Advisory Committee on Science and Technology (1964—1975)
Elected Chairman, United Nations Advisory *Committee on Science and Technology* (1971—1972)
Member, United Nations Panel and Foundation Committee for the United Nations University (1970—1973)
Member, United Nations University Advisory Committee (1981—1983)
Member, Council, University for Peace (Costa Rica) (1981—1986)
Elected Chairman, UNESCO Advisory Panel on Science, Technology and Society (1981)

5. Other Assignments

Member, Scientific Council, SIPRI (Stockholm International Peace Research Institute) (1970)
Elected Vice Chairman, International Union of Pure and Applied Physics (IUPAP) (1972—1978)
Elected First President of the Third World Acedemy of Sciences (1983—

6. Awards for Contributions to Physics

Hopkins Prize (Cambridge University) for the most outstanding contribution to physics during 1957—1958 (1958)
Adams Prize (Cambridge University) (1958)
First recipient of Maxwell Medal and Award (Physical Society, London) (1961)
Hughes Medal (Royal Society, London) (1964)
J. Robert Oppenheimer Memorial Medal and Prize (University of Maimi) (1971)
Guthrie Medal and Prize (Institute of Physics, London) (1976)
Sir Devaprasad Sarvadhikary Gold Medal (Calcutta University) (1977)
Matteuci Medal (Accademia Nazionale di XL, Rome) (1978)
John Torrence Tate Medal (American Institute of Physics) (1978)
Royal Medal (Royal Society, London) (1978)
Noble Prize for Physics (Nobel Foundation) (1979)
Einstein Medal (UNESCO, Paris) (1979)
Shri R.D. Birla Award (Indian Physics Association) (1979)
Josef Stefan Medal (Josef Stefan Institute, Ljublijana) (1980)
Gold Medal for outstanding contributions to Physics (Czechoslovak Academy of Sciences, Prague) (1981)
Lomonosov Gold Medal (USSR Academy of Sciences) (1983)

7. Awards for Contributions Towards Peace and Promotion of International Scientific Collaboration

Atoms for Peace Medal and Award (Atoms for Peace Foundation) (1968)
Peace Medal (Charles University, Prague) (1981)
Premio Umberto Biancamano (Italy) (1986)
Dayemi International Peace Award (Bangladesh) (1986)

8. Academies and Societies

Elected, Fellow, Pakistan Academy of Sciences (Islamabad) (1954)
Elected, Fellow of the Royal Society, London (1959)
Elected, Fellow, Royal Swedish Academy of Sciences (Stockholm) (1970)
Elected, Foreign Member of the American Academy of Arts and Sciences (Boston) (1971)
Elected, Foreign Member, USSR Academy of Sciences (Moscow) (1971)
Elected, Foreign Associate, USA National Academy of Sciences (Washington) (1979)
Elected, Foreign Member, Accademia Nazionale dei Lincei (Rome) (1979)
Elected, Foreign Member, Accademia Tiberina (Rome) (1979)
Elected, Foreign Member, Iraqi Academy (Baghdad) (1979)
Elected, Honorary Fellow, Tata Institute of Fundamental Research (Bombay) (1979)
Elected, Honorery Member, Korean Physics Society (Seoul) (1979)
Elected, Foreign Member, Academy of the Kingdom of Morocco (Rabat) (1980)
Elected, Foreign Member, Accademia Nazionale delle Scienze (dei XL), (Rome) (1980)
Elected, Member, European Academy of Science, Arts and Humanities (Paris) (1980)
Elected, Associate Member, Josef Stefan Institute (Ljublijana) (1980)
Elected, Foreign Fellow, Indian National Science Academy (New Delhi) (1980)
Elected, Fellow, Bangladesh Academy of Sciences (Dhaka) (1980)
Elected, Member, Pontifical Academy of Sciences (Vatican City) (1981)
Elected, Corresponding Member, Portuguese *Academy of Sciences (Lisbon)* (1981)
Founding Member, Third World Academy of Sciences (1983)
Elected, Corresponding Member, Yugoslav Academy of Sciences and Arts (Zagreb) (1983)
Elected, Honorary Fellow Ghanna Academy of Arts and Sciences (1984)
Elected, Honorary Member Polish Academy of Sciences (1985)
Elected, Corresponding Member, Academia de Ciencias Medicas, Fisicas y Naturales de Guatemala (1986)

9. Orders

Order of Nishan--Imtiaz (Pakistan) (1979)
Order of Andres Bello (Venezuela) (1980)
Order of Istiqlal (Jordan) (1910)
Cavaliere di Gran Croce dell'Ordine al Merito della Repubblica Italiana (1980)

10. D.Sc. Honoris Causae

Punjab University, Lahore, Pakistan (1957)
University of Edinburgh, Edinburgh, UK (1971)
University of Trieste, Trieste, Italy (1979)
University of Islamabad, Islamabad, Pakistan (1979)
Universidad National de Ingeniera, Lima, Peru (1980)
University of San Marcos, Lima, Peru (1980)
National University of San Antonto Abad, Cuzco, Peru (1980)
Universidad Simon Bolivar, Caravas, Venezuela (1980)
University of Wroclow, Wroclow, Poland (1980)
Yarmouk University, Yarmouk, Jordan (1980)
University of Istanbul, Istanbul, Turkey (1980)
Guru Nanak Dev University, Amritsar, India (1981)
Muslim University, Aligarh, India (1981)
Hindu University, Banaras, India (1981)
University of Chittagong, Bangladesh (1981)
University of Bristol, Bristol, UK (1981)
University of the Maiduguri, Maiduguri, Nigeria (1982)
University of the Philippines, Quezon City, Philippines (1982)
University of Khartoum, Khartoum, Sudan (1983)
Universidad Complreose de Madrid, Spain (1983)
The City College, The City University of New York, New York, USA (1984)
University of Nairobi, Nairobi, Kenya (1984)
Universidad Nacional de Cuyo, Cuyo, Argentina (1985)
Universidad Nacional de la Plata, La Plata, Argentina (1985)
University of Cambridge, UK (1985)
University of Goteborg, Goteborg, Sweden (1985)
Kliment Ohridski University of Sofia, Sofia, Bulgaria (1986)
University of Glasgow, Glasgow, Scotland (1986)
University of Science and Technology, Hefei, China (1986)
The City University, London, UK (1986)

11. Pakistan Assignments

Member Atomic Energy Commission, Pakistan (1958-1974)
Elected President, Pakistan Association for Advancement of Science (1961—1962)
Adviser, Education Commission Pakistan (1959)
Member, Scientific Commission, Pakistan (1959)
Chief Scientific Adviser to President of Pakistan (1961—1974)
Founder Chairman, Pakistan Space and Upper Atmosphere Committee (1961—1964)
Governor from Pakistan to the International Atomic Energy Agency (1962—1963)
Member, National Science Council, Pakistan (1963—1975)
Member, Board of Pakistan Science Foundation (1973—1977)

12. Pakistani Awards

Sitara-i-Pakistan (S.Pk.) (1959)
Pride of Performance Medal and Award (1959)
The Order of Nishan-e-Imtiaz (the highest civilian award) (1979)

13. As "Servant of Peace"

Member, Scientific Council, SIPRI (Stockholm International Peace Research Institute) (1970—)
Awarded the Atoms for Peace Medal and Award (Atoms for Peace Foundation) (1968)
Peace Medal (Charles University, Prague) (1981)
Premio Umberto Biancamano, Italy (1986)
Dayemi International Peace Award (Bangladesh) (1986)
Member, Council, University for Peace, Costa Rica (1981—1986)

14. Published Papers

Around 250 scientific papers on physics of elementary particles. Papers on scientific and educational policies for developing countries and Pakistan.

15. Scientific Contributions

Research on physics of elementary particles. Particular contributions :

(*i*) two-component neutrino theory and the prediction of the inevitable parity violation in weak interactions;

(*ii*) gauge unification of weak and electromagnetic interactions; the unified force is called the "electroweak" force—a name given to it by Abdus Salam; predicted existence of weak neutral currents and *W, Z* particles before their experimental discovery.

(*iii*) symmetry properties of elementary particles; unitary symmetry;

(*iv*) renormalisation of meson theories;

(*v*) gravity theory and its role in particle physics; two tensor theory of gravity and strong interaction physics;

(*vi*) unification of electroweak with strong nuclear forces, grand (electro-nuclear) unification;

(*vii*) related prediction of proton-declay;

(*viii*) supersymmetry theory, in particular formulation of superspace and formalism of superfields.

16. Books

Symmetry Concepts in Modern Physics, Iqbal Memorial Lecture, (Pakistan Atomic Energy Centre, Lahore), 1966.

Edited with E.P. Wigner, *Aspects of Quantum Mechanics* (Cambridge University Press), 1972.

Ideals and Realities, Selected Essays of Abdus Salam, Edited by Z. Hassan and C. H. Lai (World Scientific Publishing Co. Pvt. Ltd., Singapore, 1984). Translated into Arabic, Chinese, Italian, Persian, Rumanian, Russian and Spanish.

With Ergin Sezgin, *Supergravity in Diverse Dimensions,* Vols. I and II, to be published by World Scientific Publjshing Company in 1987.

Biography, *Abdus Salam,* by Dr. Abdul Ghani, (Ma'aref Printers Limited, Defence Housing Society, Karachi), 1982.

آدمی کے خیالات و نظریات پر اس کی ثقافتی
میراث اور تمدنی روایات کا اثر ہوتا ہے۔
(پروفیسر عبدالسلام)

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے خاندان کے افراد کی فہرست

والد محترم چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم

والدہ محترمہ ہاجرہ بیگم صاحبہ مرحومہ

بہن	محترمہ مسعودہ بیگم صاحبہ مرحومہ[1]	پیدائش ۳۰ اپریل ۱۹۲۲ء
خود	محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سائنسدان	" ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء
بہن	محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ[2]	" ۲۳ مارچ ۱۹۲۷ء
بھائی	محترم چوہدری محمد عبدالسمیع صاحب	" ۱۰ مارچ ۱۹۳۱ء
بھائی	محترم چوہدری محمد عبدالحمید صاحب	" ۱۹ ستمبر ۱۹۳۳ء
"	" " محمد عبدالماجد صاحب	" ۲۳ دسمبر ۱۹۳۴ء
"	" " محمد عبدالقادر صاحب	" ۱۳ جولائی ۱۹۳۷ء
"	" " محمد عبدالرشید صاحب	" " "
"	" " محمد عبدالوہاب صاحب	" ۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے اہل وعیال

اہلیہ اوّل محترمہ امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ[3]

دختر	محترمہ ڈاکٹر عزیزہ بیگم صاحبہ	پیدائش ۸ جون ۱۹۵۰ء
"	" آصفہ بیگم صاحبہ	" ۱۴ نومبر ۱۹۵۵ء
"	" آنسہ بشریٰ صاحبہ	" ۷ دسمبر ۱۹۵۶ء
پسر	محترم احمد سلام صاحب	" ۸ جولائی ۱۹۶۰ء

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی ایک اور بیوی یورپین قومیت کی ہیں جن میں سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں ؛

---

[1] محترمہ مسعودہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر صاحب کی پہلی والدہ محترمہ سعیدہ بیگم صاحبہ مرحومہ سے پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی ڈاکٹر صاحب کے تایا زاد بھائی محترم چوہدری عبدالشکور صاحب سے ہوئی ؛

[2] محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ سکرو ملک بشیر احمد صاحب کی اہلیہ ہیں ؛

[3] محترمہ امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ ڈاکٹر صاحب کے تایا کی بیٹی اور چوہدری عبدالشکور صاحب کی حقیقی بہن ہیں ؛

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے والد صاحب کا کشف

صداقت احمدیت کا نشان

کی ایک شام کی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے والد ماجد مسجد احمدیہ جھنگ میں مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے کہ انہوں نے بحالت کشف دیکھا کہ کسی نے ایک خوبصورت بچہ ان کی گود میں رکھا ہے بچے کا نام پوچھنے پر بتایا گیا کہ اس کا نام **عبدالسلام** ہے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے والد صاحب نے اپنا یہ کشف سیدنا حضرت امیرالمومنین خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا اور اپنے گھر پیدا ہونے والے بچے کے لئے نام رکھنے کی درخواست کی حضور رضؓ نے فرمایا کہ جب خدا نے خود ہی اس بچے کا نام تجویز فرما دیا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں مداخلت کرنے والے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے والد محترم کا یہ کشف صداقت احمدیت کا ایک چمکتا ہوا نشان ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف اپنے سچے مامور امام مہدی اور مسیح موعود مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کو سچی پیشگوئیوں اور بشارتوں سے نوازتا ہے بلکہ آپ کے غلاموں کو بھی سچی پیشگوئیوں اور بشارتوں سے حصہ عطا فرماتا ہے۔

یہ واقعہ ہر اس شخص کے لئے جسے احمدیت کی صداقت میں شبہ ہے ایک عجیب نصیحت کا رنگ رکھتا ہے۔

اپنے علم کا فیض دوسروں تک بھی پہنچایئے

اللہ تعالیٰ کے فضل سے دنیا بھر میں مختلف علوم کے سینکڑوں ماہرین جماعت احمدیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اگر وہ اپنے مخصوص علم کے حوالے سے ہی بدر کے لئے ٹھوس، مفید، علمی اور تحقیقی مضامین لکھ کر بھجوائیں تو اس سے اخبار کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔ (مدیر)

(بشکریہ: خواب اور حقیقت)

★

سائنس کی دنیا میں ہے جن کا بہت اونچا مقام
ایسے مخلص ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر عبدالسلام

ساری دنیا پر ہے واضح ان کی جدت کا کمال
عالم تحقیق میں جن کی نہیں ملتی مثال

یوں انہیں سیر و سیاحت کی بھلا فرصت کہاں
دوستوں کا پیار لایا ہے انہیں ہندوستاں

ان کے استقبال میں ہے دیدہ دل فرش راہ
خیر مقدم کرتا ہے ان کا ہجوم بے پناہ

ہو تیرا دورہ مبارک ہو تجھے عبدالسلام!
اور بھی روشن ہو دنیا میں مسلسل تیرا نام!

ہے دعا غازی کی تم ہندوستاں میں آبسو
دوستوں کے قدردانوں کے جہاں میں آبسو

خان غازی کابلی

"اسلامی کہاوت "خیرات گھر سے ہی شروع ہوتی ہے" کے مصداق سلام صاحب سے رہبری اور مدد کا متمنّی کوئی نوجوان پاکستانی کبھی مایوس نہیں ہوا ان کے مغربی طلباء بھی اپنی امداد کے معاملے میں ان کی فیاضی کے معترف ہیں"۔ (نیجل کالڈر)

بقیہ صـ ۱۲:

کو زندہ رکھنے کے لئے جس توانائی کی ضرورت پڑتی ہے اس کا ان نتائج سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے جو اس تحریک کو حاصل ہوتے ہیں۔

پھر سے کانفرنس کی طرف واپس آتے ہوئے مجھے یہ بتانے میں بڑا ملال ہے کہ وسائل کے مبادلے کے سلسلے میں کوئی نئے اقرار نہیں ہوئے۔ یہ نئے ادارے اسی پرانی بات کو مختلف انداز میں اپنا لیں گے اور ان کی کثرت عالمی ترقی کے کسی خوش آئند تصوراتی انداز کا احساس کرنے کے لئے کوئی آسانی مہیا نہیں کرے گی۔

میں اب آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میرے سامعین، مجھے آپ ہی سے امید ہے کہ آپ صحیح طور پر ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کریں گے جن کا ذکر میں کر چکا ہوں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ میں یہ بتانا چاہوں گا کہ اس کے لئے بڑے ایثار کی ضرورت ہے۔ لیکن میں اخلاقی قدروں میں یقین رکھتا ہوں اور اپنی اس بات کو ایک صوفی جان ڈان کے الفاظ سے ختم کروں گا جس نے سترہویں صدی میں آدمی کے بین الاقوامی خاندانی تصور کی بات کی تھی "کوئی بھی شخص ایک جزیرے کی طرح اپنے آپ میں مکمل نہیں ہے۔ ہر شخص برصغیر کا ایک حصہ ہے، کل کا ایک جزو۔ اگر یورپ کی سرزمین سے مٹی کا ایک ڈھیر بھی سمندر سے بہہ جائے تو یورپ اسی طرح کم ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک بڑی چٹان بہہ جائے یا جیسا کہ تیرے دوست کی جاگیر یا پھر تیری خود کی۔ کسی بھی شخص کی موت مجھ کو گھٹا دیتی ہے کیونکہ میں انسانیت میں ملوث ہوں اور اسی لئے کسی کو یہ معلوم کرنے کے لئے مت بھیج کہ یہ ماتمی گجر کس کے لئے بج رہا ہے، یہ تیرے ہی لئے بج رہا ہے۔"

پتھہ پریم میں تربیتی اجلاس

مورخہ ۹ راگست کو بعد نماز مغرب مسجد احمدیہ میں محترم سی کے شمس الدین صاحب قائد مجلس خدام الاحمدیہ کی زیر صدارت ایک تربیتی جلسہ منعقد ہوا محترم این شفیق احمد صاحب کی تلاوت اور صدارتی تقریر کے بعد مکرم سی کے منصور احمد صاحب، محترم پی پی حمزہ صاحب زعیم مجلس انصار اللہ محترم پی پی حسن کویا صاحب صدر جماعت احمدیہ محترم سی کے بیران صاحب، محترم ایم سی سلیمان صاحب محترم این شفیق احمد صاحب اور خاکسار سی ایچ عبد الرحمٰن معلم وقف جدید نے مختلف موضوعات پر تقریر کی
صدارتی تقریر اور اجتماعی دعا کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا

سی ایچ عبد الرحمٰن معلم وقف جدید

جلسہ پیشوایان مذاہب

یکم ستمبر کو بعد مغرب جلسہ یوم پیشوایان مذاہب نہایت شان سے ہوا بارش کے موسم کے سبب توقع نہ تھی کہ جلسہ اس قدر شاندار ہوگا ہندوستان کے مشہور پنڈت بھی میری دعوت پر تشریف لائے بھدرک سے مولوی شمس الحق صاحب بھی پہنچ گئے کثیر تعداد میں ہندو دوست بھی تشریف لائے اڑیہ میں مکرم سید انوار الدین صاحب نے تقریر کی مکرم سید محمد سلیمان صاحب نے مختصر تقریر کی مکرم نسیم احمد صاحب اور مکرم رفیق احمد صاحب نے نظم پڑھی مکرم مولوی شمس الحق صاحب نے گیتا اور وید کے حوالے سے تقریر کی جو ہندو بھائیوں نے بہت پسند کی بعدہ پنڈت گوتم مہارانہ نے ہندو دھرم کے بارہ میں بھائی چارہ کے متعلق تقریر کی اسے بھی حاضرین نے پسند کیا صدارتی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

سیف الدین صدر جماعت احمدیہ سونگھڑہ

تربیتی اجلاس

یکم ستمبر سے احمدیہ مسجد سری نگر میں ایک تربیتی کلاس کا اجراء ہوا جو انشاء اللہ ہر اتوار کو لگا کرے گی عزیز طاہر احمد زاہد کی تلاوت کلام پاک اور عزیز بشیر نیاز صاحب کی نظم خوانی کے بعد محترم مولوی غلام نبی صاحب نیاز انچارج مبلغ نے اجتماعی دعا کرائی بعدہ خاکسار نے خدام و اطفال کو ضروری امور کی طرف توجہ دلائی محترم مولوی غلام نبی صاحب کے خطاب کے بعد تمام حاضرین کی چائے سے تواضع کی گئی۔ اس کلاس کے انعقاد کے سلسلہ میں محترم غلام رسول صاحب صدر جماعت، مکرم ڈاکٹر اعجاز احمد صاحب قائد علاقائی اور مکرم تنویر احمد خان صاحب قائد مقامی نے بھرپور تعاون دیا۔

قریشی بشیر احمد مبلغ سلسلہ سرینگر کشمیر

لجنہ اماء اللہ حیدر آباد کے تحت جلسہ تربیت

لجنہ اماء اللہ حیدر آباد نے بتاریخ یکم ستمبر احمدیہ جوبلی ہال میں زیر صدارت محترمہ اعظم النساء صاحبہ صوبائی صدر لجنہ آندھرا پردیش جلسہ منعقد کیا مکرمہ راشدہ تنویر فضل نے تلاوت کی عہد نامہ کے بعد محترمہ محمودہ رشید صاحبہ نے احادیث کا درس دیا اور عزیزہ وحیدہ آفرین نے ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ السلام پڑھ کر سنائے اجلاس میں محترمہ صالحہ حمید صاحبہ نے بعنوان "قرآن کریم بے نظیر کتاب ہے" محترمہ سیما جاوید صاحبہ نے "قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت" عزیزہ امتہ البصیر آفتاب نے "طب نبوی صلعم" کے عنوان پر تقریر کی بعدہ محترمہ امتہ النعیم بشیر صاحبہ نے "حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے نماز کے متعلق ارشادات" پڑھ کر سنائے اس دوران عزیزہ شاہدہ مجیب، عارفہ رحمٰن، نافیہ اختر، محترمہ نزہت ناصر صاحبہ نے نظمیں پڑھیں۔ آخری تقریر محترمہ زہرہ صدیقی صاحبہ نے نمازوں کی اہمیت و عظمت پر کی بعدہ نماز اور قرآن مجید کے تعلق سے سامعین سے چند سوال کئے گئے یہ پروگرام بڑا ہی دلچسپ اور معلوماتی تھا جسے سب نے پسند کیا بعد دعا جلسہ اختتام کو پہنچا۔

امتہ النعیم بشیر صدر لجنہ اماء اللہ حیدر آباد

تعلیم الاسلام پبلک سکول آسنور کشمیر میں تقریب تقسیم انعامات

۱۰ راکتوبر کو تعلیم الاسلام احمدیہ پبلک سکول آسنور (کشمیر) میں تقسیم انعامات کی تقریب منعقد ہوئی اس موقعہ پر محترم عبد الحکیم صاحب وانی چیئرمین اسکول بحیثیت مہمان خصوصی رونق افروز تھے ۲ بجے تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نظم سے ہوا بعد ازاں مکرم عبد القیوم صاحب ناصر ٹیچر اسکول نے تقریب کی غرض و غایت بیان کی مہمان خصوصی نے بچوں میں انعامات تقسیم کئے دس طلباء کو دوران سال مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی کی بناء پر انعامات دئے گئے انہیں بہترین طالب علم کے اعزازی سرٹیفکٹ سے بھی نوازا گیا۔ دوران سال منعقد ہونے والے مختلف علمی اور ورزشی مقابلہ جات میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے طلباء کو بھی انعامات دئے گئے۔
آخر پر محترم مہمان خصوصی نے اسکول کی کارکردگی کو سراہا اور بچوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔
دعا کے ساتھ تقریب کا اختتام ہوا۔

پرنسپل تعلیم الاسلام احمدیہ پبلک سکول آسنور

لجنہ اماء اللہ قادیان کے تحت جلسہ تحریک جدید

۴ نومبر کو محترمہ معراج سلطانہ صاحبہ صدر لجنہ اماء اللہ قادیان کی صدارت میں جلسہ تحریک جدید منعقد ہوا محترمہ عطیۃ القدوس صاحبہ کی تلاوت کے بعد محترمہ فریدہ بشارت صاحبہ نے نظم خوش الحانی سے سنائی ازاں بعد محترمہ نسیم اختر صاحبہ نے "تحریک جدید کی اہمیت" محترمہ سوسن قدیر گوہر صاحبہ نے "حضرت مصلح موعود کا عظیم کارنامہ" اور محترمہ سہیلہ فرید صاحبہ کی نظم خوانی کے بعد محترمہ قیصرہ عدن صاحبہ نے بعنوان "تحریک جدید کی برکات" تقریر کی آخر میں محترمہ صدر اجلاس نے خطاب کے بعد دعا کرائی۔

راشدہ پروین مودھا جنرل سیکرٹری لجنہ قادیان

لجنہ اماء اللہ دہلی کا تیسرا سالانہ اجتماع

لجنہ اماء اللہ دہلی نے ۲۹ ستمبر کو اپنا تیسرا لوکل سالانہ اجتماع منعقد کرنے کی سعادت پائی۔ اجتماع سے قبل ہی محترمہ صدر صاحبہ کی نگرانی میں اجتماع کے کاموں کو انجام دینے کے لئے ڈیوٹیاں تقسیم کی گئیں جو ممبرات نے احسن رنگ میں سرانجام دیں

ٹھیک ۱۱ بجے اجتماع کے افتتاحی پروگرام کا آغاز زیر صدارت محترمہ امتہ الحفیظ صاحبہ صدر لجنہ دہلی محترمہ راشدہ نصیر صاحبہ کی تلاوت قرآن کریم مع ترجمہ سے ہوا محترمہ بشریٰ ابرار صاحبہ کی قیادت میں ممبرات نے عہد نامہ دہرایا محترمہ ناصرین کوثر کی نظم خوانی کے بعد صدر اجلاس نے افتتاحی خطاب فرمایا جس میں آپ نے حضور ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کا پیغام جو حضور نے از راہ شفقت اجتماع کے لئے بذریعہ فیکس بھجوایا تھا سنایا بعد ازاں محترمہ صدر صاحبہ لجنہ اماء اللہ بھارت کی طرف سے آمدہ پیغام بھی سنایا گیا۔ اجتماعی دعا کے بعد لجنہ اماء اللہ دہلی کی سال ۱۹۹۵-۹۶ء کی سالانہ رپورٹ محترمہ نصیرہ سلطانہ نے پڑھ کر سنائی بعد ازاں محترم مولوی سید کلیم الدین صاحب نے قرآن مجید کا درس دیا

اگلا پروگرام زیر صدارت محترمہ مقبول بیگم صاحبہ سابقہ صدر لجنہ دہلی شروع ہوا مہمان خصوصی کے طور پر محترمہ مسز ظفر صاحبہ رونق افروز ہوئیں محترمہ بشریٰ ابرار صاحبہ نے تاریخ پارے پیش کئے۔ محترمہ مقبول بیگم صاحبہ نے بعنوان "جماعت احمدیہ کا تعارف" تقریر کی وقفہ کے دوران ممبرات نے نماز باجماعت ادا کی

دوسرا اجلاس تین بجے محترمہ رضیہ بیگم صاحبہ کی صدارت میں شروع ہوا مہمان خصوصی محترمہ ممدود بیگم صاحبہ تھیں۔ اجلاس میں محترمہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہ صدر لجنہ دہلی نے "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر" محترمہ صبیحہ ظفر صاحبہ نے "فضائل قرآن مجید" عنوان کے تحت تقریر کی، اور محترمہ کوثر صبیحہ صاحبہ نے نظم پڑھی اگلے اجلاس کی صدارت محترمہ امتہ الحفیظ صاحبہ صدر لجنہ دہلی نے کی۔ محترمہ نسیم بیگم صاحبہ نے بعنوان "تربیت اولاد" تقریر کی پروگرام کے آخر میں علمی اور ورزشی مقابلہ جات میں حصہ لینے والی ممبرات میں انعامات تقسیم کئے گئے۔ اول۔ دوم۔ سوم آنے والی ممبرات کے علاوہ ناصرات کی بچیوں اور اطفال کو نماز مکمل یاد کرنے پر خصوصی انعامات دئے گئے۔ صدر اجلاس نے اختتامی خطاب میں جملہ صدر صاحبات اور حاضرات جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کرائی۔ اجتماع میں لجنہ دہلی کی ۹۵ فیصد حاضری رہی اس کے علاوہ ۱۲ غیر مسلم اور ۱۹ غیر احمدی بہنوں نے شرکت کی آنے والی مستورات نے بہت دلچسپی کے ساتھ پورے پروگرام کو سنا اور بہت متاثر ہوئیں جلسہ کے اختتام پر کئی سوالات کئے جن کا تسلی بخش جواب دیا گیا۔ اجتماع کے دن دونوں وقت کے کھانے کا تمام حاضرین جلسہ کے لئے انتظام کیا گیا۔ اجتماع سے ایک ہفتہ قبل علمی اور ورزشی مقابلہ جات کروائے گئے

خدا تعالیٰ ہماری حقیر مساعی کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔

نصیرہ سلطانہ جنرل سیکرٹری لجنہ دہلی

بقیہ صفحہ اوّل: اور میری محبت دلوں میں بٹھائے گا اور میرے سلسلہ کو تمام دُنیا میں پھیلائے گا اور سب فرقوں پر میرے فرقہ کو غالب کرے گا اور میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رُو سے سب کا منہ بند کر دیں گے اور ہر ایک قوم اس چشمہ سے پانی پئے گی اور یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جائے گا۔ بہت سی روکیں پیدا ہوں گی اور ابتلاء آئیں گے مگر خدا سب کو درمیان سے اُٹھا دے گا اور اپنے وعدہ کو پورا کرے گا اور خدا نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔" (تجلیات الٰہیہ صفحہ ۲۱-۲۳)

بقیہ صفحہ ۲۰

ہیں اس کی ذمہ داری ان ترقی پسند اور روشن خیال تنظیموں پر عائد ہوتی ہے جو پاکستان کے روادار اور کشادہ دل عوام کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر اس المناک صورت حال کے ذمہ دار ایسے تمام دانشور ہیں جو اپنی جاعتی وابستگی یا کسی خوف یا کسی مصلحت کے سبب سچ بولنے اور سچے موقف پر اصرار کرنے سے دامن بچاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام اس صدی میں طبیعیات کے شعبہ کی عظیم ذہانتوں میں سے ایک ہیں جس دھرتی سے اُن کا خمیر اُٹھا اُسے اُن پر ناز کرنا چاہیئے تھا لیکن یہ ان کی نہیں ہماری سیاہ بختی ہے کہ ہم نے انہیں جلاوطنی اور بے توقیری کے عذاب میں ڈالا۔

ہماری دُعا ہے کہ ہمارے منافق راہنماؤں کی عمر اور صحت اُنہیں لگے مغرب سے متعدد معاملات پر شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ہمارے جلاوطنوں کو پناہ وہیں ملتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر مغرب کے شہر ہمارے اس نابغہ روزگار کو پناہ نہ دیتے تو آج وہ بھی ابن تیمیہ کی طرح کسی قید خانے میں ہوتا اُسے بھی کاغذ و قلم کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہوتا اور وہ اپنے ناخنوں سے کوٹھری کی دیواروں پر یہ جملہ کھرچ رہا ہوتا کہ اگر مجھے کوئی حقیقی سزا دی گئی ہے تو وہ یہی سزا ہے شکریہ!

بشکریہ ایم۔ ٹی۔ اے ۲۲ر نومبر ۱۹۹۶ء

پیشکش: ایچ شمس الدین قادیان

بقیہ صفحہ ۱۴

آج ہیں" پھر بھی وہ کچھ سمتوں میں ہونی سست رفتار ترقی کو تسلیم کرتے ہیں۔ پاکستان میں سائنس کی قیمت پر آرٹس کو دی جانے والی غیر ضروری اہمیت کا چلن اب ختم ہو رہا ہے۔ صدر پاکستان خود سلام صاحب کے سائنس کی کتب کی اشاعت کے جذباتی رُجحان میں بھرپور تعاون دے رہے ہیں۔ یونیورسٹی میں اب نوجوان طلبا سائنس پڑھنے کی طرف راغب ہیں۔

بچپن ہی سے جب سلام صاحب نے فارسی فلسفی اور ڈاکٹر ابو سینا کی پُرانی کتاب کے ذریعے جھنگ میں عطار کو جوشاندہ اور دیگر شربت وغیرہ بناتے دیکھا تھا "تب ہی سے انہوں نے اسلامی سائنس اور ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ آج بھی ان کا مستقبل کے پاکستان کا تصور صرف مادی ضروریات کی تکمیل تک ہی محدود نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے "ایک مرتبہ کوئی قوم بلندیوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دے تو عالموں کو معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے"۔ پاکستان کے دورے کے دوران ان کا شعر پڑھتے ہوئے شعراء کے درمیان قدردان اور نکتہ چین سامع کی حیثیت سے دیکھا جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

اسلامی کہاوت "خیرات گھر سے ہی شروع ہوتی ہے" کے مصداق سلام صاحب سے رہبری اور مدد کا متمنی کوئی نوجوان پاکستانی کبھی مایوس نہیں ہوا۔ ان کے مغربی طلبا بھی اپنی امداد کے معاملے میں ان کی فیاضی کے معترف ہیں۔

سلام صاحب کافی جلدی جلدی ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے دورے پر جاتے رہتے ہیں لیکن بہ نسبت سائنسدانوں کی مانند وہ بیوروکریٹوں کو اپنے ذاتی تحقیقی کاموں میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے برعکس پاکستان اور اقوام متحدہ سے متعلق اپنے صلاح کارانہ امور میں وہ مفلس طبقے میں پیدا ہونے والے کسی ایسے انسان کے جذبات جو خود کو تمام انسانوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت تصور کرتا ہے مجروح کرنے کی اجازت اپنے سائنسی تصنع کو ہرگز نہیں دیتے۔

ٹریسٹے میں ڈائرکٹر کے دفتر کی دیوار پر سولہویں صدی کی ایک فارسی کی دُعائیہ تحریر کندہ ہے "اس نے پکارا اے خدا معجزہ دکھا دے" سلام صاحب کی قوت اس اعتقاد میں مضمر ہے کہ معجزے آج بھی ممکن ہیں بشرطیکہ کوئی بشر اس حد تک چلا جائے کہ ان کے ظہور پذیر ہونے کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWS PAPER FOR INDIA AT NO - R.N.61/57

FAX - 01872 - 20105 ☎ 01872-20757

THE WEEKLY **BADR** QADIAN 143516

DISTT GURDASPUR PUNJAB (INDIA)

VOL - 45 THURSDAY,5.12 DECEMBER 1996 ISSUE NO - 49.50

یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم نے ڈاکٹر عبد السّلام کو جلاوطنی اور بے توقیری کے عذاب میں ڈالا

پاکستان کی نامور ادیبہ زاہدہ حنا کا کڑوا سچ

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام صاحب مرحوم و مغفور کی ستّرویں سالگرہ کے موقع پر ۲۹ جنوری کے روز کراچی میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں پاکستان کے دانشوروں اور ادیبوں نے کھل کر اس امر پر روشنی ڈالی کہ پاکستان کی ملائیت اور مذہبی انتہا پسندی کے باعث وہاں کے عوام بالخصوص نوجوان ڈاکٹر صاحب سے وہ فوائد حاصل نہ کرسکے جن کے وہ اولین حقدار تھے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ ان سب کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے پھر بھی اہل وطن کے لئے اپنی حد استطاعت تک بہت کچھ کیا ـــ ملاحظہ فرمائیے یہ کڑوا سچ ـ !!

جناب صاحبِ صدر معزز خواتین و حضرات!

کیا آج ہم اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دُنیا کا ایک ذی وقار شہری اور مایہ ناز سائنسدان ستّر برس کا ہو گیا۔ کیا ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ اس انسان کو اس کے سائنسی کارناموں پر داد دیں اس کے علم و فضل کے باب میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائیں اور واپس چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اس لئے آئے ہوں لیکن معافی کی طلبگار ہوں کہ میں یہاں اس لئے نہیں آئی۔

وہ شخص جو مغرب و مشرق کی دو درجن سے زیادہ یونیورسٹیوں کا اعزازی ڈگری یافتہ ہے جسے دو درجن سے زیادہ اعلیٰ ترین بین الاقوامی اعزازات سے نوازا جا چکا جو دو درجن سے زیادہ اہم ترین سائنسی اور تحقیقی کام کرنے والی سوسائٹیوں کی فیلوشپس اور ممبر شپس رکھتا ہے اسے آپ کی اور میری تعریف و توصیف کی ذرہ برابر ضرورت نہیں۔

مَیں یہاں حاضر ہوئی ہوں تو اس لئے کہ ڈاکٹر عبد السلام کی ستّرویں سالگرہ کے موقع پر اپنی اور اپنی قوم کی بدبختی پر گریہ کردں، اس بات کو کہوں کہ ہم نے نوبل انعام یافتہ عبد السلام کے ساتھ وہی کچھ کیا جو ہم سینکڑوں برس سے اپنے علماء و فضلاء کے ساتھ کرتے آئے ہیں

ہم تاریخ کے اتنے بڑے جھوٹے ہیں کہ کل اپنے جن خرد افروز اور علم دوست مفکروں، دانشوروں اور فلسفیوں پر ہم نے کفر و الحاد کے فتوے لگائے تھے، جن پر زیست حرام کر دی تھی آج ہم انہی ناموں کے آگے "رحمۃ اللہ علیہ" لکھتے ہیں اور ان کے نام سے پہلے "امام" نہ لکھنے کو کفر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ ہم بھول چکے ہیں کہ ابن حزم کا مدرسہ اور کتب خانہ ہم نے جلایا تھا۔ اور اسے قید و بند کی مصیبتوں سے ہم نے گزارا ہے

آج وہ ہمارے لئے امام ابن حزم ہے، ہم کسی کو یہ نہیں بتاتے کہ ہم نے ابن تیمیہ کی کتابیں جلائیں اور اسے قید کیا اور جب اس پر بھی ہمارا جی خوش نہ ہوا تو قید کے دوران اس سے تصنیف و تالیف کی آزادی سلب کرلی، اس کی کتابیں اور مسودے ضبط کر لیے آج ہم اُسے امام لکھتے نہیں تھکتے اور تاریخ کا یہ سچ چھپا دیتے ہیں کہ کاغذ و قلم سے محروم ہونے والے ابن تیمیہ نے اپنے قید خانے کی دیواروں پر اپنے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کیا جملہ لکھا تھا۔

مسلم دُنیا کا آخری نابغۂ روزگار ابن رُشد جو اپنے خیالات و افکار کے سبب بہت ذلیل و رسوا ہوا جسے مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر نمازیوں کے جوتے صاف کرنے کی سزا دی گئی، جسے جلا وطن کیا گیا جس کی کتابیں قرطبہ کے چوک میں جلائی گئیں

آج اسی ابن رشد کے حوالے سے ہم یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں۔

ہم فخر سے یہ کہتے ہیں کہ روجر بیکل نے ۱۲۳۰ء میں ابن رشد کی کتابوں کے لاطینی ترجمہ کو یورپ کی علمی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ قرار دیا ہے۔

عالمِ اسلام میں علم پروری اور عقل دوستی کا زوال ابنِ ہیثم اور البیرونی سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور یہ عمل بارھویں صدی کے آخری برسوں میں ابن رُشد کی ذلت آمیز جلا وطنی کے بعد مکمل ہوا۔ اس عظیم سانحے کو ہزار برس گزر چکے لیکن بستیوں نے مسلسل اُترتے رہنے اور یورپی استعمار کی نو آبادیات بن جانے اور نام نہاد سیاسی آزادی کے بعد مغرب کی اقتصادی غلامی میں آنے کے باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی کے باب میں ایک روشن خیال اور وسیع المشرب سماج کی تعمیر کے سلسلے میں ہمارے رویے آج بھی دسویں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے آگے نہیں بڑھے۔

ابن رُشد کو ہسپانیہ کے یہودیوں نے اپنے سینے سے لگایا اور اس کے خیالات و افکار یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کا نکتۂ آغاز بنے اور ہم آج آٹھ سو برس بعد بھی اتنے ہی بد بخت ہیں کہ ہم نے اپنے ایک نابغۂ روزگار کے لئے اس کے اپنے ملک میں عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

دیارِ غیر میں جلا وطنی کی زندگی گزارنے والے ڈاکٹر عبد السّلام سے اب مغرب و مشرق کی ذہانتیں استفادہ کرتی ہیں۔ یہ شخص طبعیات کا نوبل انعام لینے جاتا ہے تو سویڈن کا بادشاہ اور ملکہ اس کا انتظار کرتے ہیں۔ شاہی خاندان کے سامنے اس کی آمد کا اعلان بگل بجا کر کیا جاتا ہے دُنیا بھر سے آئے ہوئے ہزارہا سائنسدان، دانشور اور طالبِ علم کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کرتے ہیں لیکن یہی نوبل انعام یافتہ سائنسدان جب اپنے ملک کا رُخ کرتا ہے تو برسرِ اقتدار خواتین و حضرات اسے ملاقات کا وقت نہیں دیتے معمولی سرکاری اہل کار سائنس کی ترقی کے لئے اس کی بیش قیمت تجاویز اور پیش کشوں کے معاملات کو سرد خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور اس شہر کا ایک تعلیمی ادارہ اُسے اپنے ہاں مدعو کرتا ہے تو مذہبی جنونیوں کا ایک ٹولہ اس کی آمد کو کفر و اسلام کی جنگ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

آج ہم تباہی و بربادی کی جس دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اس کا بنیادی سبب ہماری علم دشمنی جہل دوستی اور اپنے عالموں اور فاضلوں کی توہین و تذلیل ہے، ہم اپنی ذہانتوں کو دیس نکالا دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، ہم اس ملک میں تفکر و تدبر کے سوتوں پر پہرے بٹھاتے ہیں، ہم اپنی دانش گاہوں میں ذہانتوں کو پنپنے نہیں دیتے اور کبھی ملحد کبھی کافر اور کبھی بے راہ رَو قرار دے کر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ دیارِ غیر کا رُخ کریں اور ان کی ذہانتیں یورپ و امریکہ میں گل و گلزار کھلائیں۔

> "آج ہم تباہی و بربادی کی جس دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اس کا بنیادی سبب ہماری علم دشمنی اور جہل دوستی ہے۔ ہم اپنی ذہانتوں کو دیس نکالا دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ ہم اپنی دانش گاہوں میں ذہانتوں کو پنپنے نہیں دیتے اور انہیں کبھی ملحد، کبھی کافر اور کبھی بے راہ رَو قرار دے کر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ دیارِ غیر کا رُخ کریں اور اُن کی ذہانتیں یورپ و امریکہ میں گل و گلزار کھلائیں"۔

ہم جس تیزی سے زوال اور ذلت آمیز غلامی کی طرف جا رہے ہیں اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہمارے سیاسی راہنما اور ہمارے دانشور منافقت میں مبتلا ہیں۔ کسی بھی قوم کی راہنمائی اس کے سیاستدان، مدبر، مفکر اور دانشور کرتے ہیں اور جب یہی طبقہ مصلحت و منافقت کا شکار ہو جائے تو قوم کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارا ہے

آج ہم میں سے کتنے ہیں کہ جو اُٹھ کر بآوازِ بلند کہہ سکیں کہ یہ وہ پاکستان نہیں ہے جس کا وعدہ جناح صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں سے کیا تھا۔ آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اس پر اصرار کرتے ہیں ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بانیٔ پاکستان نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست نہیں ہو گا اور یہ کہ اس نئے وطن میں مذہب نسل رنگ اور زبان کو تفریق کا سبب نہیں ٹھہرایا جائے گا اور پاکستان کے تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام ہر مرتبہ تنگ نظر مذہبی راہنماؤں کو مسترد کر دیتے ہیں اور جمہوریت پسندی و روشن خیالی کے دعویدار سیاست دانوں کو حقِ حکمرانی سونپتے ہیں لیکن ایسی ہر جماعت اقتدار میں آنے کے بعد منافقت اور سیاسی مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے سول اور فوجی نوکرشاہی اور جاگیرداری کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ لبرل عوام کی نمائندہ اور بانیٔ پاکستان کے سیاسی افکار کی پیروکار ہونے کی دعویدار جماعتیں ESTABLISHMENT سے اس قدر خوفزدہ رہتی ہیں اس کی بہترین مثال پاکستان کا آئین ہے ان جماعتوں نے ESTABLISHMENT کے دباؤ میں آکر آئین میں ایسی تبدیلیاں کیں یا ایسی ترامیم کو تحفظ فراہم کیا جس نے پاکستانی آئین کو بانیٔ پاکستان کی یک سیاسی فکر سے یکسر متصادم آئین بنا کر رکھ دیا۔

آج اگر ڈاکٹر عبد السلام اس محفل میں موجود نہیں اور وطن سے دُور شدید ذہنی اذیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اگر وہ وطن میں اپنی بے وقعتی اور ناقدری پر غمزدہ ہیں اور آج اگر وہ اس ملک کے دوسرے درجے کے شہری ہیں تو اس کے ذمے دار نہ پاکستانی عوام ہیں اور نہ بانیٔ پاکستان اس تمام صورت حال کی ذمہ داری ان سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو خود کو قائد اعظم کا وارث کہتی ہیں لیکن عملاً ان کے افکار کی نفی کرتی

(باقی صفحہ ۱۹ پر)